محمد احسن فاروقی

سنگم

ناشر

لبنیٰ پبلیکیشنز

۲۰۷- الحیات چیمبرز ایم - اے جناح روڈ
کراچی ۳

پیدائش:
تعلیم:
ملازمت:
قیام:
۱۹۳۰ء

کا نام آج سرفہر
طرف سے داد کا
اس کے بعد فا
ایم-اے "لکھا جو
شائع ہو چکے ہیں
قید خانے میں پ
سنگم

جس میں اُنہوں
کی تکنیک اُردو
ایک ایسا کارنامہ
بیاد کو تیز کر دیا ہے
سے شروع ہوتا ہے
ایک زندہ جیتا جا
اشارہ ہے۔ ابن مسلم
متاثر ہوتا ہوا انتہ
روپ میں سامنے آ

Scanned with CamScanner

دیباچہ

طبع اوّل

قیامِ پاکستان ہماری تاریخ کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اس کا آغاز محمود غزنوی کے حملوں سے ہوتا ہے۔ اور اسکا نقطۂ عروج برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت کا دور ہے۔ کیا کوئی نقشہ ایسا بنایا جا سکتا ہے جو ۱۰۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کی تاریخ کا احاطہ کر سکے؟ کوئی تمثیل؟ ناول ایسی ہو سکتی ہے جو سارے قصے کو ایک مخصوص اور مربوط ہیئت کے تحت سامنے لے آئے؟

شگوفہ اس سوال کا جواب ہے۔

درحقیقت ناول کی "ڈول" اور "پلاٹ" جو یہاں پیش کیا گیا ہے۔ مسلم اور اسپارٹا کے قصے کے ذریعے ہندوستان میں مسلمانوں کی ساری تاریخ پیش کرتی ہے۔ ؎

بیاور بیگر انتخاب بود زبان دانے
فقیر شہر سخن ہائے گفتنی دارد

محمد احسن فاروقی

فہرست

حصہ اول

سحرالکرما........

(محمود غزنوی کے قنوج پر حملے سے علاؤالدین خلجی کا چتوڑ کی رانی پدمنی سے شکست تک)

(۱)

ابن مسلم محمود غزنوی کی فوج میں ایک معمولی سپاہی تھا۔

قنوج پر حملے کے بعد محمود غزنوی کی فوج واپس ہو رہی تھی۔ کچھ عرصہ کے لیے اس نے گنگا کے کنارے پڑاؤ ڈالا تھا۔ ابن مسلم سب سے الگ ہو کر گنگا کے کنارے کھڑا لہروں پر ناچتے ہوئے سورج کی چمک کو دیکھ رہا تھا۔ گنگا کا پانی سفید تھا۔ اسے جمنا بھی یاد آ رہی تھی جس کے کنارے بھی فوج نے آتے میں پڑاؤ ڈالا تھا۔ مگر جمنا کا پانی سبز تھا۔

اس نے سنا تھا کہ یہ دونوں دریا کہیں جا کر مل جاتے ہیں۔۔۔۔ کہاں؟۔۔۔۔ اگر وہ گنگا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ تیرتا چلا جائے تو اس مرج البحرین تک پہنچ جائے گا؟۔۔۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہاں دونوں دریاؤں کے سنگم کو دیکھے۔ ضرور دیکھے۔

اگر وہ پیچھے بیٹھ گیا اور فوج کوچ کر جائے تو وہ اس غیر ملک میں اکیلا رہ جائے گا۔۔۔ اس کی صورت اور ڈھانچہ صاف عربوں کا سا تھا۔۔۔۔ دریا میں اس کا عکس کتنا لمبا دکھائی دے رہا تھا۔۔ اسے یہاں کے لوگ اکیلا دشمن پا کر مار ڈالیں گے۔۔۔ مگر یہ خوف؟۔۔۔ یہ گناہ عظیم ہے۔۔۔ اسلام ہمت کا نام ہے۔۔۔ علی خیبر شکن۔۔۔ حسین شہید کربلا۔۔۔ یہ سب لوگ اس کے جد تھے۔۔۔ ان کا خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔۔۔ لاتخف

اس کے جد کا حکم تھا جو اللہ کی طرف سے آیا تھا۔

مگر سنگم دیکھنے کی خواہش فی سبیل اللہ تھی یا اس کی ذاتی خواہش تھی؟ ...... ذاتی خواہش کوئی چیز نہیں ...... فسیروا فی الارض ...... خدا کی قدرت کی سیر مرج البحرین یلتقیٰن ...... فبای آلاء ربکما تکذبٰن ...... یہاں تک آنے کے بعد وہ اللہ کی اس رحمت کو دیکھے بغیر واپس نہ جائے گا ...... وہ سنگم پر ضرور جائے گا۔ اس کی خواہش حکم الہٰی تھی۔

اور اس کی خواہش پوری ہونے کا ذریعہ بھی نکل آیا۔ دریا کے اس پار سے ایک ناؤ آتی دکھائی دی۔ قریب آتی گئی اور آ کر اس کے پاس کنارے سے لگ گئی۔ اس میں چار پانچ ننگے بدن لنگوٹا باندھے کالے ہندوستانیوں کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا ساتھی بھی راجپوتوں کا لباس پہنے ہوئے بیٹھا تھا۔ یہ فوج کے لئے رسد لایا تھا جس سے ناؤ بھری ہوئی تھی۔ اس نے ناؤ سے اترتے ہی کہا۔ "کیوں بھئی مسلم کیا سوچ رہے ہو ......؟"

"یہ گنگا اور وہ جمنا ایک جگہ پر ملتی ہیں۔ میں وہ مقام دیکھنا چاہتا ہوں۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ۔ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ"

"یہ کوئی بڑی بات ہے" اور وہ ہندوستانیوں سے ان کی زبان میں باتیں کرنے لگا جو ابن مسلم کی سمجھ میں نہ آئیں۔ پھر ابن مسلم کی طرف مڑ کر بولا "مگر تم میرا یہ راجپوتوں کا لباس پہن لو ...... اپنے لباس میں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے ...... یہ ملاح اپنے ہی مگر راستے میں اگر ......"

دونوں کناروں سے کافی دور ایک خیمے میں چلے گئے۔ ملاح سامان اتارتے رہے۔ دن چڑھ آیا۔ ابن مسلم سر پر راجپوتوں کی سی پگڑی باندھے جسم پر انگرکھا پہنے اور زیب دار دھوتی باندھے واپس آیا اور ناؤ میں بیٹھ گیا۔ ملاح ناؤ کو منجدھار میں لے آئے اور وہ دھارے پر تیزی سے چلنے لگی۔ ساون کا مہینہ تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ دونوں کناروں پر ہرے بھرے درخت نظر آ رہے تھے۔ ابن مسلم محویت کے عالم میں آ گیا تھا وہ جنت میں تھا ...... گنگا جمنا عینٰن تجریٰن۔ ان کے درمیان جنتیں جنتیں جنتیں۔ یہی وہ باغ تھے جن کی بشارت رحمۃ للعالمین نے دی تھی۔ یہی

ابن مسلم کا تصور تھے۔ یہ تمام گروہ سورۃ رحمٰن خود پڑھتا۔ اس سے جو جنت کا تصور اس کے ذہن میں قائم ہو گیا تھا وہ آج صورت مجاز میں آتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

فضا ایک نور سے معمور تھی نور جسمانی نور بدل کر ایک پراسرار روشنی پھیلا رکھی تھی جو دریا کی لہروں درختوں کی پتیوں اور تیز بہتے ہوئے پانی ناؤ کو ایک آہنگ میں موجود دکھا رہی تھی۔ ابن مسلم کی زبان پر سورۃ رحمٰن جاری تھا۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ پر وہ جھوم جھوم جاتا تھا۔

معلوم بھی نہ ہوا کہ کتنی دیر میں سفر ختم ہو گیا۔

"یہ ترینی۔ تربینی جی کی جے۔" ملاحوں کی آواز سے وہ چونک پڑا۔

سنگم پر آ کر ناؤ بالکل ساکت ٹھہر گئی۔ ملاحوں نے چپو چھوڑ دیئے۔ ابن مسلم نے ناؤ کے داہنے جانب سبز اور بائیں جانب سفید پانی کو غور سے دیکھا۔ ناؤ کے سامنے ...... ایک پراسرار لکیر دور تک پڑی چلی جا رہی تھی۔ ناؤ کے پیچھے بھی ویسی ہی لکیر زمین تک دکھائی دے رہی تھی۔ ایک طرف سبز سبز جمنا بہتی آ رہی تھی۔ اور دوسری طرف سفید گنگا۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ۔ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ سنگم کی لکیر کس قدر سیدھی تھی۔ ایسا خط مستقیم اس نے کبھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ملاحوں نے کشتی کو اس خط پر جما دیا تھا۔ کشتی اسی خط پر چلی جا رہی تھی۔ ملاحوں نے اسے بتایا کہ یہ تربینی ہے تیرا دریا گنگا ایک جمنا دوسرا اور تیسرا سرسوتی۔ یہ تیسرا بھگوان کے ملک میں بہتا ہے آسمانی دریا ہے۔ ابن مسلم کو ان کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ پر پورا یقین آ گیا۔ اس کی آسمانی کتاب میں تو اس مرج البحرین کا ذکر تھا ہی۔

وہ بالکل بھول گیا کہ وہ اس دنیا میں تھا۔ وہ جنت میں پہنچ گیا تھا۔ وہ کوثر اور تسنیم کے سنگم پر رواں تھا۔ ھذہ الجنت الحق ...... دنیا میں تھا۔ فضا روحانی۔ دریا روحانی۔ اس میں اس کی روح کی ناؤ چلی جا رہی تھی۔ ملاحوں کے چہرے پر بھی ایک روحانیت نمایاں تھی۔ وہ تربینی کو دل سے پوج رہے تھے عجیب سپردگی کے عالم میں تھے۔ ابن مسلم

خواب کے عالم ہی میں رہا۔ یہاں تک کہ تربینی کی سیر ختم ہو گئی۔

ملاحوں نے بہاؤ کے خلاف زور سے چپو چلانا شروع کر دیا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے دل کو کوئی زبردستی ہلا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ زندگی بھر تربینی ہی پر بیٹھا رہے۔ وہ سنبھل کر بیٹھا۔ تربینی کا خط اس سے دور ہوتا گیا اور غائب ہو گیا۔ ناؤ کنارے کے قریب چل رہی تھی۔ ملاح بانس اور چپو چلانے میں مصروف تھے۔ ابن مسلم کی نگاہوں کے سامنے تربینی کا خط تھا اور وہ پھر محویت کے عالم میں آ گیا تھا۔

ملاحوں نے ایک باغ کے پاس ناؤ روک لی اور اتر گئے۔ وہ بھی چونکا۔ ان لوگوں نے اشارے کئے وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا جیسے آموں سے لدے ہوئے پیڑوں کے درمیان آ گئے۔ ملاحوں نے آم توڑے خود کھائے اور اسے کھلائے۔ وہ کھاتا ہی گیا۔ وہ پہلے بھی آم کھا چکا تھا۔ مگر اس وقت جو آم کھا رہا تھا ان سے زیادہ لذیذ کبھی کوئی چیز اس نے نہ کھائی تھی۔ "فیہما فاکھۃ"..... یہ جنت کے پھل تھے۔ ان میں تمام پھلوں کا مزا اپنے کمال پر تھا۔ اس کا پیٹ بھر گیا مگر طبیعت نہ بھری۔

... ناؤ پر واپس آ کر اس نے چلو میں لے کر گنگا کا پانی پیا۔ سفید پانی۔ پاک پانی۔ یہ پانی برسوں رکھا جائے خراب نہیں ہوتا۔

اب وہ ناؤ میں بیٹھا تو وہ ایک مخصوص نشے کے عالم میں تھا۔ ناؤ آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ وقت کا احساس بالکل جاتا رہا تھا۔ سورج بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ کہیں کہیں اکا دکا بوندا باندی بھی ہوئی۔ معلوم نہیں کب وہ سو گیا اور کب جاگ اٹھا۔ سب خواب تھا۔ خواب کی طرح دلکش خواب کی طرح بے بنیاد خواب کی طرح بے ترتیب ناؤ ایک باغ کے پاس سے گذری جس میں ڈیرے پڑے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک پیڑ میں جھولا پڑا تھا۔ چار لڑکیاں پیڑے پر بیٹھی تھیں ایک رسی پکڑے کھڑی پینگ بڑھا رہی تھی۔ ملاح ناؤ کھینا بھول گئے۔ ناؤ رک گئی۔ ابن مسلم ان لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔ سب جوان تھیں۔ بڑی بڑی آنکھوں والی

تھیں۔ گوری تھیں جیسے "مقصورات فی الخیام"۔ سب گنوار۔ یاں تھیں "لم یطمثھن انس قبلھم ولا جان"۔ ایک نے اس کی طرف دیکھا۔ شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ دوسری لڑکیوں کو اشارہ کیا۔ سب جھولا روک کر بھاگیں اور ڈیرے میں غائب ہو گئیں۔

"ناؤ پھر چلنے لگی۔ اس باغ سے دور ہوتی گئی۔ ابن مسلم کے سامنے ان لڑکیوں کی ہنستی ہوئی آنکھیں تھیں۔ "لولؤ المکنون" "قاصرات الطرف" کیا آنکھیں تھیں۔ کیا مسکراہٹ ہنستی ہوئی آنکھیں۔ فریب نرگس مستانہ...

"معلوم کتنی دیر کے بعد اس کے کان میں ایک نہایت سریلی آواز آئی: "گھر آئی بدریا کاری۔ ہم لگی۔ اب پیا کا پکارے بام لگی اب پیا کا پکارے ہاری ہیرت ہون ندیا کنارے" عجیب راگ تھا۔ ایسا سریلا ایسا میٹھا راگ اس نے کبھی نہیں سنا تھا۔ وہ عجیب کیف کے عالم میں آ گیا۔ الفاظ کے معنی اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ مگر راگ کے بول بار بار اس کے حافظے پر ثبت ہو گئے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے دل کی دھڑکن بھی یہی راگ گا رہی تھی۔ گنگا بھی یہی راگ گا رہی تھی۔ آسمان پر بادل بھی یہی راگ گا رہے تھے۔ ناؤ کے چپو بھی یہی راگ گا رہے تھے۔ ساری کائنات اس راگ کو گانے میں محو تھی وہ اس راگ میں بالکل گم ہو گیا۔

پھر ایک اور باغ دکھائی دیا۔ حقیقت میں یا خواب میں! مگر دکھائی دیا۔ ایک راجہ جس کے سر پر مور بندھا ہوا تھا۔ مرلی بجا رہا تھا۔ ایک رانی اس کے سینے پر سر ٹیکے کھڑی تھی۔ ان دونوں کے چاروں طرف گھیرا ڈالے ہوئے نہ معلوم کتنے راجہ اور کتنی رانیاں اسی گت میں بالکل اسی صورت کی ناچ رہی تھیں۔ مرلی کی آواز عجیب تھی۔ رقص کا کیف عجیب تھا۔ ملاح اس کو دیکھ کر سربسجود تھے۔ ابن مسلم کھو گیا۔ یہ کیف عجیب تجربہ تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ خود راجہ ہے۔ مرلی کی آواز اس کی روح سے نکل رہی تھی۔ پوری کائنات میں گونج رہی تھی۔ گنگا اس کی رانی تھی۔ اس کے

Scanned with CamScanner

پیچھے پیر سر رکھے تھی۔ تمام پیر گوپیاں تھیں وہ ان سب کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ اور
ان کے درمیان کھڑا مرلی بجا رہا تھا۔ مرلی کی آواز کو سن بھی رہا تھا۔ خود بھی محو تھا اور گانا
کو بھی محو کئے ہوا تھا۔ یہ عجیب راز تھا۔ آسمانی راز۔ جنت کا راز۔ یہ راز کبھی اسے بتایا ہی
گیا تھا۔ قرآن شریف میں صور آواز کا ذکر تھا۔ کیا یہ مرلی اسی صوت کو پیدا کر رہی تھی۔ مگر یہ
رقص یہاں کا تو کہیں ذکر نہ تھا۔ مرد اور عورت ساتھ ساتھ رقص کرتے ہوئے۔ یہ رقص
کائنات کا رقص۔ وہ اپنی آنکھوں سے کائنات کو رقص کرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ دیکھتا
رہا۔۔۔ دیکھتا ہی رہا۔۔۔۔ اس رقص کے ختم ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔۔۔۔ یہ
رقص یہ حی القیوم کا رقص تھا۔۔۔۔۔۔

موہن کی مرلیا باجے۔ مرلی کے دائمی راگ میں یہ آواز شامل ہوتی ہوئی سنائی دی۔ وہ
چونک پڑا۔ کنارے پر ایک مندر بنا تھا۔ اس میں سے یہ آواز آ رہی تھی۔ مندر خوشنما تھا
اس پر گل بوٹے اور لاتعداد مورتیں بنی ہوئی تھیں۔ ملاح ناؤ کو کنارے لگا کر اتر گئے۔ ابن
نے بھی اترنا چاہا۔ ملاحوں نے اشارے سے اسے روکا۔ وہ کئی دفعہ اٹھا مگر ہر دفعہ اشاروں
سے ملاح اسے روکتے رہے۔ آخر کو وہ نہ اترا۔ ملاح مندر کے اندر گئے۔ مندر کے دروازے
پر جو اس سے کافی اونچائی اور دوری پر تھا۔ ایک مجسمۂ نور نظر آئی۔

یہ کہاں سے آئی تھی؟ مندر میں سے نکلی تھی؟ زمین میں سے ابھری تھی؟ آسمان پر سے گری
تھی؟ بجلی کی طرح چمک کر آئی تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے لمبی لمبی سیاہ لٹیں کمر پہ پڑی تھیں۔ سفید ساڑھی
جسم پر کسی لپٹی ہوئی تھی چہرہ نور کی تو معلوم ہو رہا تھا۔ ماتھے پر سرخ سیندور کی بندیا لگی ہوئی تھی۔
بڑی بڑی سیاہ آنکھیں عجیب مستی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ مہین گلابی ہونٹوں پر آفاقی مسکراہٹ
کھیل رہی تھی۔ ابن مسلم اسے دیکھ کر کھو گیا۔ مسکراہٹ میں اس کرشمے کی روح نظر آئی۔
ابن مسلم کو محسوس ہوا کہ پوری کائنات مسکرا اٹھی۔ اس سے نہ رہا گیا۔ ناؤ سے اتر کر وہ اس کی طرف
بڑھتا۔ وہ چنچل پاؤں کھسکتی ہوئی مندر کے دروازے کی طرف چلی۔ ابن مسلم بڑھتا گیا وہ

اور ہانپتی ہوئی مندر میں چلی گئی۔ ابن مسلم مندر کے دروازے پر آیا اس نے دیکھا کہ وہی مجسمۂ
نور دیوار سے لگی ہوئی بت یا مورتی ہو گئی۔)

ملاح اس وقت نکلنے لگے اور اس کو اشارے کرتے ہوئے ساتھ لے آئے۔ یہ
"اما پاروتی" کہہ کر ملاحوں نے مندر کی طرف دیکھا اور ناؤ کھینے لگے۔

"اما پاروتی! کیا معنی؟" ابن مسلم سوچتا رہا۔ مگر اس نور کے مجسمے اور اس کی
مسکراہٹ نے ابن مسلم کے دل میں عجیب ہیجان برپا کر دیا۔ محویت اور کیف کا عالم بدل گیا ایک
عجیب خواہش ایک عجیب حرکت ایک عجیب زندگی کا عالم وجود میں آ گیا تھا۔ وہ بے چین تھا وہ چاہتا
تھا کہ دریا میں کود جائے۔ اس مندر پر پہنچے۔ کیا وہ اس مسکراتی ہوئی نورانی بت کا سجدہ کرے گا۔
نہیں۔ لا الٰہ الا اللہ مگر نہیں وہ اس کے درشن کریگا۔ دیکھے ہی جائیگا۔ اس کا نور کائنات ہے۔ اس
کی آنکھیں زندگی ہیں۔ اس کی مسکراہٹ حرکت ہے ترقی ہے سب کچھ ہے۔ ہائے وہ نور۔ ہائے وہ آنکھیں
ہائے وہ مسکراہٹ۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔ ہائے"

"آؤ جانیوالے بالم آ۔ لوٹ کے آ۔ لوٹ کے آ" یہ اس دیوی کی آواز اس کے کان میں آ رہی تھی۔
اسے بیقرار کر رہی تھی۔ وہ اس کے معنی نہیں سمجھتا تھا "آ۔ آ۔ آ" ضرور وہ اس کو بلا رہی تھی۔ وہ اس کے
پاس جانے کو بیتاب رہا تھا۔ پھر رکتا ہی رہا۔

ناؤ فوج کے پڑاؤ پہ پہنچ گئی تھی۔ کوچ کا حکم ہو چکا تھا۔ خیمے اکھاڑے جا رہے تھے۔ ابن مسلم
اپنے خیمے میں آیا۔ اس کا گھوڑا اسے دیکھ کر ہنہنایا۔ اس نے پھر مسلمان سپاہی کے کپڑے پہن لئے ہتھیار
لگائے۔ گھوڑے پر زین کسی لگام لگائی۔ اس کا خیمہ بھی اکھاڑا جانے لگا۔ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر فوج
کے دستے میں آ ملا۔

فوج غزنی کا رخ کئے چلی جا رہی تھی۔ سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے درمیان ابن مسلم کا
گھوڑا بھی تھا۔ وہ سب کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ مگر اس کا دل ایک بت کا نور۔ اس کی آنکھوں کی
چمک اس کی مسکراہٹ کے کرشمے کا نقشہ لئے جا رہا تھا۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ "لوٹ کے آ" کے کیا معنی

Scanned with CamScanner

ہیں۔ "جانے والا" کسے کہتے ہیں اور "بالم" کیا ہوتا ہے۔ اس کے کانوں میں وہ گیت گونج رہا تھا "او جانے والے بالم آ لوٹ کے آ۔ آ لوٹ کے آ۔" فوج نے جمنا میں گھوڑے ڈال دیئے۔ ابن [illegible] کے گھوڑے نے رُخ بدل کر بہاؤ کے ساتھ تیرنا شروع کر دیا۔ مگر فوج کے ساتھ ہی دریا پار کرنا پڑا۔ اس پار پہنچ کر پھر وہی گیت کانوں سے دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا...... ستلج...... راوی...... سندھ، کابل، سب دریاؤں کو پار کرنے میں یہی حال ہوا...... درۂ خیبر سے گذرتے وقت اسے یہ محسوس ہوا کہ وہ ایک بڑے قید خانے میں جا رہا تھا۔ جس کا دروازہ یہ تھا۔

فوج غزنی پہنچ گئی۔ غزنی اس کا وطن نہیں تھا۔ اس کا باپ بلخ سے یہاں آیا تھا۔ دادا ایران میں رہا تھا۔ پر دادا بغداد میں۔ اس سے پہلے مکہ وطن تھا۔ اس کا وطن کونسا ملک تھا۔ غزنی میں وہ پیدا ہوا تھا۔ مگر افغان اسے عرب کہتے تھے۔ اس کا باپ مر چکا تھا۔ وہ بھی سپاہی تھا۔ ماں پہلے ہی مر گئی تھی۔ باپ کی افغان بیوی سے بچے تھے وہ اس سے بے تعلق تھے۔ غزنی میں اس کا کچھ نہ تھا۔ وہ غزنی چھوڑ دے گا۔ ہندوستان کو اپنا وطن بنائے گا۔ وہیں سنگم پر اسی مندر کے قریب رہے گا۔ وہ بت پھر زندہ ہو کر اس کے پاس آ جائیگی۔ وہ ہر آن اسے بلاتی ہے۔ "او جانیوالے بالم آ۔ لوٹ کے آ۔ لوٹ کے آ۔"

اپنے ساتھی سپاہیوں میں اس کا دل نہ لگتا۔ بازاروں میں ہندوستان سے لایا ہوا مالِ غنیمت کا ڈھیر لگتا۔ اسے دیکھ کر وہ دل میں کہتا "یہ لوٹ کا مال ہے۔ ڈاکہ زنی" اور منہ پھیر کر آگے بڑھتا۔ ایک مقام پر ہندوستانی عورتیں بھی بیچی جاتیں۔ انہیں دیکھ کر وہ ترس کھاتا۔ یہ پیڑ سے ٹوٹے ہوئے پھولوں کی طرح مرجھائی ہوئی معلوم ہوتیں۔ اس کے سپاہیوں میں سے بہت سے حسین حسین لڑکیاں لائے تھے۔ مگر ان کا حسن کملایا ہوا نظر آتا۔ زمین۔ ہوا۔ ماحول بدلنے سے یہ بوکھلائی ہوئی نظر آتی تھیں اس کے دل میں ایک بت تھی۔ کیا وہ اسے لے آیا تھا وہ ہر سانس [illegible] بلایا کرتی تھی۔ وہ سوچا کرتا کہ پھر محمود حملہ کرنے جائے اور پھر وہ سنگم پر جا بیٹھے۔

ایک دن وہ علامہ عصر البیرونی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ علامہ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔

شاگرد دو زانو سامنے تھے۔ البیرونی اپنی ہندوستان پر کتاب کی باتیں کر رہے تھے۔ اس کی نقل کی ضرورت تھی۔ البیرونی کی کتاب کی نقل کرنا اس کے لئے تسکین بخش مشغلہ ٹھہرا۔ کبھی کبھی علامہ اکیلے ہوتے تو اُسے پاس بلا کر باتیں کرنے لگتے۔ وہ سوال کرتا "اُما پاروتی کے کیا معنی ہیں؟" علامہ سمجھاتے "اُما ہماوتی ایک لڑکی تھی جو ہماوتی کی پوجا کے لئے تارک الدنیا ہو گئی تھی۔ ہماوت پہاڑ کو کہتے ہیں۔ ہم برف کو کہتے ہیں۔ ہمالیہ برف سے ڈھکا ہوا۔ ہماوت برف کا پہاڑ۔ تو اُما ہماوتی دیوی کو پوجا کرتی تھی جو پہاڑوں میں گم بیٹھے تھے۔ پاروتی کے معنے ہیں قوت کی دیوی۔ اسے پراکرتی بھی شکتی بھی کہتے ہیں۔ لکشمی بھی کہتے ہیں۔ اُما پاروتی ہماوتی کی پجارن اور دنیا کو پالنے والی۔ وہ گنگا جمنا کے دو آب کی دیوی ہے۔ اس کے مندر جگہ جگہ ملتے ہیں۔"

"میں نے سنگم کے قریب اسے دیکھا"

"اُسے؟ تمہارا وہم! اس کا بت دیکھا ہوگا؟"

"حضور سے کیا عرض کروں۔ میں نے بڑے بڑے بال نورانی چہرہ۔ بڑی آنکھیں اور مسکراہٹ سب کچھ ایک زندہ عورت میں بھی دیکھیں اور وہی عورت بت ہو گئی۔"

"خیر ذہن خلاق ہے۔ تمہارے اندر شاعر کی قوتِ تخیل ہے۔ تم نے اسے زندہ دیکھ لیا...... خیر وہ بت بڑی چیز ہے۔"

"زحمت نہ ہو تو اس کے معنے بیان فرمادیں۔ مجھے اس سے بہت دلچسپی ہو گئی ہے۔"

"اچھا سنو۔ ہندیوں کی بت پرستی تمہارے عربوں کی سی نہیں ہے۔ ہندو لوگ فطرتی شاعر ہیں۔ ہر خیال کو تصویر میں بدل لیتے ہیں۔ — رَبُّ العالمین بہت بڑا خیال ہے۔ ہر شخص اپنے ملک کا رب دیکھتا ہے۔ جگ کا پالنہار جگ اس کے لئے کہیں اپنا گاؤں ہے کہیں اس سے بڑا خطہ۔ پالنے والی عموماً ماں ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک دیوی تصور ہوتی ہے۔ اس کے سر کے بال پیداوار کا اشارہ۔ اس کا سفید لباس اور اس کا نور روح کا اشارہ۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ اُف...... ان آنکھوں کو وہ شہد کی مکھی سے تشبیہ دیتے میں تو گزر

پھول کی پنکھڑی پر بیٹھی شہد پی رہی ہو۔ کیا مطلب؟ آنکھیں زندگی کا اشارہ ہیں۔ جدوجہد، پرورش۔ پھول میں سے رس نکالنا۔ کام میں مست اور مسکراہٹ قیامت ہے۔ کائنات کی بنیاد یہ مسکراہٹ ہے۔ زندگی بغیر اس مسکراہٹ کے کٹ ہی نہیں سکتی۔ اسے ہدایت کہو۔ دلچسپی کہو، سکون کہو۔ قَلْبٌ مُطْمَئِنَّۃ کہو۔

ابن مسلم بغور سنتا۔ اور سوچتا کہ اس بت پرستی میں کتنا لطف تھا۔ وہ پاروتی کے تصور کو پوجنے لگا تھا۔ جب نماز پڑھنے کھڑا ہوتا تو یہ تصور اس کے سامنے آجاتا۔ البیرونی سے باتیں کرنے میں اُسے بڑی دلچسپی ہوگئی۔ اس نے سب گیتوں کے معنے سمجھ لئے جو اس نے سُنے تھے۔ اس نے کرشن کی مرلی اور رقص کے معنے بھی جان لئے۔ البیرونی کی کتاب سے بھی اسے ہندیوں کی تہذیب و ثقافت کا بہت کچھ معلوم ہوا اس نے دل میں ٹھان لی کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن بنائے گا۔

وہ جوان تھا خوش رو تھا تندرست تھا۔ اس کے ساتھ بہت سے لوگ اپنی لڑکیوں کی شادی کرنا چاہتے تھے مگر اس کے معاشرے میں زیادہ تر جوان بیوائیں تھیں جو کنوارپنے میں بڈھوں سے بیاہی گئی تھیں اور شوہروں کے مرنے پر بیوہ ہوگئی تھیں۔ کنواری لڑکیوں سے بڈھے شادی کرتے۔ ہر جوان کو پہلے ایک بیوہ ملتی پھر کہیں کنواریاں ملتی رہتیں کئی کئی بیوائیں اس کی تاک میں تھیں۔ وہ سب کے ساتھ شادی کر سکتا تھا مگر نہیں وہ ایک سے شادی کرنا چاہتا تھا! اُما پاروتی سے۔ لوگ کہتے ہیں یہ محض تصور تھی نہیں وہ حقیقت تھی۔ اسی مندر کے پاس وہ کہیں رہتی ہوگی۔ وہ فردا اسے ڈھونڈھ لے گا۔ کاش سلطان محمود پھر قنوج پہ حملہ کریں!

شَاعِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ — کچھ لوگ اسے شاعر کہتے کچھ مجنون۔ مگر وہ شاعر تو تھا ہی نہیں۔ ملک الشعراء عنصری کے اشعار زبان زد خلائق تھے۔ مگر اسے یہ شعر نہ بھاتے تھے۔ محمود غزنوی نے عنصری کا منہ جواہرات سے بھرا کیوں کہ عنصری نے یہ شعر پڑھا سہ

در فخر دریا شد صدف بر خجلت خود معترف
تا شد لعلی از ابر کف شہر تا دغـ بار ریختہ

اس شعر میں کیا بات ہے سلطان کی سخاوت کی مدح۔ الفاظ معلوم ہوتا ہے کہ پانی کے پتھر لوٹ رہے ہیں.... گھر گھر آئی بدلیا کاری ..... اُف ..... کیا سماں ہے ساون کا مہینہ بادلوں کا گھر گھر آنا ...... اُما پاروتی۔ الفاظ میں کیا نرمی ہے۔ وہ آب کی نرم ملی گنگا کا نرم خرام ...... موہن کی مرلیا باجے .... وہ قیامت کی مرلی۔ اُف اس میں کیا رنگ تھا..... او جانے والے بالم آ...... لوٹ کے آ...... اُما پاروتی مجھے خود بلا رہی ہے۔ ہندوستان کی روح عاشق ہے میں معشوق ہوں عنصری کی شاعری کچھ نہیں۔ وہ ایسا شاعر نہیں ہونا چاہتا تھا۔

اور فردوسی شاہنامہ جو لکھ رہے تھے۔ فردوسی کا محل اور باغ پرانی ایرانی تہذیب کی ہر چیز سے سجے تھے کوئی چیز اسے اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس کے دادا بھی عرض طوس میں آ رہے تھے۔ امام علی ابن موسیٰ الرضاؑ مگر وہ عرب تھے۔ آل رسول تھے ساسانی بادشاہوں کو اس فوج نے ختم کیا تھا جو خلیفہ وقت عمرؓ کے دوران خلافت میں اس کے جد علی مرتضیٰ نے ختم کی تھی ساسانیوں کا بیش بہا شطرنج اس کے جد نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ فردوسی اس تہذیب کی عظمت دکھانے چلا ہے۔ اس میں کچھ ساسانی خون ضرور تھا۔ امام حسینؓ کی شادی شہزادی شہربانو سے ہوئی تھی۔ علی ابنُ الحُسین آدھے ایرانی تھے وہ خون اس تک آیا تھا مگر نہیں وہ ساسانیوں کے آتشکدوں کو ختم کرنے والوں میں سے تھا۔ اُسے شاہنامہ بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ رستم کے فرضی کارناموں کے بجائے وہ اپنے جد علی مرتضیٰ شیر خدا کے کارنامے کیوں نہ بیان کرے..... مگر یہ شاعری اس کے بس کی چیز نہ تھی اور وہ ہندوستان والی شاعری؟ اسے ہندستانی کے صرف تین جملے ہی تو آتے تھے۔

شاعری کو خیرباد۔ وہ سپاہی ہی رہے گا۔ محمود اب کب فوج کشی کرے گا!!!

سلطان محمود نے پھر فوج تیار کی۔ اب کی وہ سومنات پر حملہ کرنے جا رہا تھا "سومنات قنوج سے کدھر ہے کتنی دور ہے؟" ابن مسلم نے دریافت کیا۔

• لاہور سے جنوب کے رُخ۔

• گنگا جمنا۔ دوآب ؟

• وہ کہاں! سومنات قنوج سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ غزنی سے قنوج۔"

وہ نہ جائے گا۔ وہ البیرونی کی کتاب لکھ رہا ہے۔ البیرونی سے کہہ کر سلطان سے یہیں ٹھہرنے کا حکم لے لیگا۔ عنصری کے قصائد کی نقل میں مصروف ہوجائے گا۔ عنصری اسے سلطان سے مانگ لے گا۔ وہ جائے گا تو وہی گنگا جمنا کے دوآب۔ اُما پاروتی کی بستی۔ سلطان حملوں کے بعد حملے کرتا رہا۔ مگر ابن مسلم فوج کے ساتھ جانے سے بچتا ہی رہا۔ غزنوی حکومت ختم ہوگئی۔ غزنی ختم ہوگیا۔ وہ سلطان معزالدین غوری کی فوج میں آگیا۔

محمد غوری کے پہلے حملے میں ہار کر وہ بھی بھاگ آیا تھا مگر دوسرے حملے کے لئے اس نے بھی بڑی تیاری کی تھی۔ تیراین کے مقام پر فتح کے بعد وہ دہلی کی طرف بڑھتا گیا تھا اور دہلی پر قبضہ کرنے والے دستے میں تھا۔ محمد غوری دہلی کی حکومت اپنے غلام قطب الدین ایبک کے سپرد کرکے چلا گیا تھا۔ بہت سے سپاہی اس کے ساتھ گئے تھے۔ ابن مسلم نے اپنی مرضی سے ایبک کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ ایبک نے انتظام سنبھالنے کے کچھ ہی عرصہ کے بعد دوآب پر قبضہ کرنا چاہا۔ ابن مسلم کے دل کی مراد آگئی۔ اس کام کے لئے جو فوج روانہ ہوئی اس میں سب میں پہلے شامل ہونے کی اس نے درخواست کی۔ حد سے زیادہ شوق کے ساتھ وہ دوآب کے راجاؤں کو ختم کرتا چلا گیا۔ وہ اپنے دستے کا سردار تھا۔ اس کے سوار راجپوتوں کو روندتے ہوئے پریاگ پہنچ گئے۔ سنگم کے پاس پریاگ کے قلعہ کو اس نے دارالحکومت بنایا۔ سلطان قطب الدین ایبک نے اس کے تقرر کا فرمان جاری کردیا۔

انتظام کے سلسلے میں وہ گھوڑے پر سوار ہوکر اپنے پیچھے سپاہیوں کا ایک دستہ لیکر سنگم پر کھڑا ہوا۔ تریبنی کا خط مستقیم اس کے سامنے دور تک کھنچتا چلا جارہا تھا۔ ایک دن وہ اسے دیکھنے آیا تھا آج وہ اس کا مالک تھا۔ سلطان کے حکم کا تابع ضرور تھا مگر زیادہ تر

حکم اسی کا تھا۔ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ۔ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ اسے اس آیت کو پڑھ کر خیال آیا۔ یہ نعمت بالکل اس کی تھی۔ وہ اس کی سیر ہی نہیں کررہا تھا...... اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہی نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اللہ نے اسے اس کا مالک بھی بنایا تھا۔ یہ جَنَّتٰنِ اب اس کے تھے۔ تمام لوگ اس کے حکم کے تابع تھے۔ وہ شکر کے عالم میں آکر پھر فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ پڑھنے لگا۔

سنگم کی لکیر دور تک چلی جارہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ صدیاں طے کررہی تھی۔ کہاں پہنچے گی؟ کہاں ختم ہوگئی؟ یہ حد نظر سے باہر تھا۔

اس نے گھوڑے سے اتر کر شکرانے کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد قرآن شریف شروع کیا۔ اس آیت پر پہنچا "وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِیْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّهُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ" اس نے چاروں طرف دیکھا۔ گنگا جمنا کی لہریں اس کی تھیں۔ جنّٰت اس کے تھے۔ ثمرات اس کے تھے مگر ازواجٌ مطہرۃ۔ اُما پاروتی۔ اُما پاروتی کہاں۔ اسے ڈھونڈتا ہے۔ کُنْتُ کَنْزُ رَحْمَتی مَخْفِیًا۔

Scanned with CamScanner

(۲)

۲

"اُما پاروتی حقیقت تھی یا محض تصور۔ میں نے اسے حقیقت ہی دیکھا مگر وہ غائب ہوگئی اور اس مندر کی مورتی بالکل اسی کی سی تھی۔ میں اس مندر تک تو پہنچ سکتا ہوں مگر اب میں حاکم ہوں، اکیلا کیسے جا سکتا ہوں۔ ہر وقت یہ سپاہی میرے ساتھ ہیں۔ کیا زندگی ہے؟ صبح اٹھ کر سپاہیوں کی دیکھ بھال۔ پھر دربار میں ہر قسم کے مقدمے فیصل کرنا۔ یہ سپاہی کمبخت عورتیں اٹھا لاتے ہیں۔ ہر ایک کے پاس چار چار تو ضرور ہوگئی ہونگی۔ چار ہونا ضروری ہیں کیا خوب! حکم چار تک کا ایک ساتھ ہے مگر ان کے لئے پوری چار کا حکم ہے..... ان عورتوں کے عزیز فریاد لے کر آتے ہیں! کیوں؟ ان کے حساب سے یہ عورتیں نجس ہو چکیں ہیں ان کو واپس لے جا کر کیا کریں گے؟ کوئی واپس نہیں لے جاتا۔ عورتیں خود واپس نہیں جاتیں سب مسلمان ہوگئیں۔ مجھے بھی کیا کیا حسینائیں نہیں پیش کی گئیں۔ مجھے اچھی لگیں مگر نہیں مجھے اور ہی کوئی چاہیے۔ اُما پاروتی۔ کہاں تو ملے گی۔

اُس نے پلٹ کر دیکھا سپاہی اس سے کافی دور پیچھے آ رہے تھے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ساون کا مہینہ تھا۔ بوندیں پڑنے لگیں۔ اس نے گھوڑا بڑھایا۔ اس کا گھوڑا بھی عرب نسل کا تھا۔ ایڑ لگاتے ہی سرپٹ بھاگ نکلا۔ سپاہی بھی اس کے پیچھے دوڑے

مگر وہ بہت آگے تھا اور اس کا گھوڑا بہت تیز تھا۔ وہ ان سے دور ہی ہوتا گیا اور دور ہی ہوتا گیا۔ پانی ریلا دھار بہنے لگا۔ آسمان پر بجلی کڑکی ایک درخت پر گری۔ درخت جلنے لگا۔ عجیب بھیانک سماں! اسے سورۂ رعد یاد آیا۔ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ پڑھتا ہوا وہ چلا ہی گیا۔ گھوڑے کی رفتار تیز ہوتی ہی گئی۔

مگر پاروتی کے اس مندر تک وہ کیسے پہنچے گا۔ مندر تو دریا کے کنارے نہیں تھا۔ [illegible] پتہ دریا کے کنارے ہی چل کر لگ سکتا تھا مگر وہ چلا ہی جا رہا تھا۔ پانی برس رہا تھا۔ وہ تر [illegible] ہوگیا تھا مگر وہ چلا جا رہا تھا۔ وہ ہرن کے شکار کو نکلا تھا۔ ہرنیں متعدد جگہ چھلانگیں مارتی ہوئی دکھائی دی تھیں مگر اس نے تیر چلانے کا خیال بھی نہیں کیا تھا۔ اب اسے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں پہنچا۔ اگر پلٹتا تو کدھر جاتا! چلتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

سہ پہر کو بادل چھٹے۔ سورج ڈھلتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ چلا ہی گیا۔ غ[illegible] سے [illegible] وہ ایک گاؤں کے پاس پہنچا۔ اس نے گھوڑا روکا۔ گاؤں کے کنویں پر [illegible]۔ ایک پنہاری پانی بھر رہی تھی جس نے لمبا سا گھونگھٹ نکال لیا۔ مسلم نے پانی مانگا۔ پنہیاری نے [illegible] سے پانی ڈالا اور مسلم نے اوک سے پیا۔ پنہیاری نے کہا۔ "تم ترک ہو"

"میں پاروتی کے مندر کی تلاش میں نکلا ہوں۔ تم جانتی ہو؟"

"کیا مندر توڑ ڈالو گے۔"

"اس میں میری اُما پاروتی ہے۔ اسے ڈھونڈنے نکلا ہوں۔ میں [illegible] نہیں توڑتا۔ ترک توڑتے ہیں۔ میں عرب ہوں۔"

"پاروتی کا مندر ادھر ندیا کنارے ہے۔ گنگا جی کے کنارے۔"

"ہاں ہاں وہی" ابن مسلم نے خوش ہو کر کہا "مجھے وہاں پہنچا دو [illegible]"

"ایک ٹنکہ! اچھا میں اپنے لڑکے کو ساتھ کئے دیتی ہوں۔ ایک ٹنکہ! [illegible]"

ابن مسلم نے فوراً اسے ایک ٹنکہ دیا اور اس کے پیچھے پیچھے اپنے گھوڑے کی [illegible]

بسنت چلا گاؤں سے ایک گیت کی آواز آرہی تھی "چلی جیسوں پیا سنگ ترے گھر نہ پھر گئی" دعو سننے پر اس کی سمجھ میں یہ بول آیا: "یہ ہندوستانی عورتیں تو ہمارے سپاہیوں کے ساتھ چلے چلنے کرتیا ہیں"۔ اس نے سوچا "ٹھیک ہے یہ ہندوستانی مرد نیا دو ترنا کارہ ہیں۔ میں دیکھ چکا ہوں۔"

پنہیاری کا لڑکا اس کے ساتھ چلا۔ وہ گھوڑے پر بیٹھ گیا اور قدم قدم چلا۔ لڑکے نے پیسہ لنگا۔ اس نے دے دیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد گنگا کا پاٹ دکھائی دیا۔ وہ پہنچے کو وہی مندر تھا جس پر اس نے اُما پاروتی کو جاتے دیکھا تھا۔ اس نے لڑکے کو واپس کر دیا۔ مندر کے دروازے پر آ کر اس نے اندر دیکھا۔ پاروتی کی مورتی بالکل اسی طرح کھڑی تھی جیسی کہ قنوج پر حملے کے وقت اُس نے دیکھی تھی۔ وہی لمبے بال وہی مست آنکھیں۔ وہی دائمی مسکراہٹ۔ مندر کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر مندر میں گھس گیا۔

وہ مورتی کے سامنے گھٹنوں پر ٹک گیا۔ ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کر کے سکوت میں آ گیا۔ اس کے کان میں آواز آئی۔ "او جانے والے بالم آ۔ لوٹ کے آ۔ لوٹ کے آ۔"

"میں لوٹ آیا" اس نے چونک کر کہا۔ آنکھیں کھول کر مورتی کو دیکھا۔ مورتی کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ ان میں حرکت ہوئی۔ مسکراتے ہوئے ہونٹوں میں بھی حرکت ہوئی اور آواز آئی۔ "تم آ گئے۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔"

"میری آنکھیں بھی اس دن سے تم کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔"

"وہ دن۔ ہاں تم نے مجھے اس دن دیکھا تھا۔ مگر میں نے تم کو صدیوں پہلے دیکھا تھا۔ پسند کر لیا تھا۔ تم اِدھر سے گزرے تھے تو میں بھی تڑپ کر باہر نکل آئی تھی۔ مگر تمہارے آنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ مجھے دو سو برس اور انتظار کرنا تھا۔ اب تم آ گئے۔"

"ہاں تمہاری محبت مجھے یہاں لے آئی۔ میں دوآب کا حاکم بنا تمہارے ہی لئے۔"

"میں سب جانتی ہوں۔"

"یہ بھی جانتی ہو گی کہ تمہارے بغیر میں نہیں جی سکتا۔"

"اور مجھے بھی تو اب تمہارے ساتھ ہی رہنا ہے۔"

"تو پھر آ جاؤ میرے ساتھ۔"

"ہاتھ بڑھا کر مجھے اس چوکی سے اتار لو۔"

ابن مسلم کھڑا ہو گیا۔ اس نے اُما پاروتی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں پر بوسہ دیا۔ پلٹا تو دیکھا گھوڑا مندر کے دروازے میں سر کئے ہوئے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ گھوڑے کی طرف بڑھا۔ گھوڑا خوشی سے ہنہنایا۔ پاروتی کو تھامے ہوئے وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ گھوڑے کی لگام بائیں ہاتھ میں لپیٹ کر اسی ہاتھ پر اس نے اُما کو بھی سنبھالیا۔ گھوڑا ایڑ پاتے ہی چل دیا۔ وہ اُما کی صورت دیکھنے میں محو تھا۔ گھوڑا چلا جا رہا تھا۔ برسات کے بادل آسمان پر رنگ برنگی شکلوں میں نمایاں ہو رہے تھے۔ گنگا بہہ رہی تھی۔ بادلوں کے عکس اس کے سفید پانی کو رنگ برنگی نقش دے رہے تھے۔ ابن مسلم پاروتی میں محو ہوا جا رہا تھا۔

رات جا چکی تھی جب وہ اپنے قلعہ کے پھاٹک پر پہنچا۔ محافظ نے اس کی آواز پہچانی۔ پھاٹک کھولا۔ اس کے ساتھ اس کی عبا میں لپٹی ہوئی ایک عورت کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔ مسٹر نے دریافت کیا "میرے ساتھ کے سپاہی سب واپس آ گئے؟"

"جی آ گئے۔ سب پریشان ہیں کہ آپ کہاں چلے گئے۔ سب صبح کو تلاش میں نکلنے والے تھے۔"

"ان سے کہو ہم آ گئے اور قاضی صاحب سے کہو فوراً تیار ہو کر ہمارے محل میں آئیں۔ یہ سب آئیں۔ ہمارا نکاح ہو گا۔"

اس کے محل میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ فوراً ہی اور روشنیوں کا انتظام ہو گیا۔ اُما پاروتی کو سونے والے حصے میں لٹا کر وہ بیٹھنے والے حصے میں آیا۔ یہاں فرش بچھا ہی تھا۔ اس کے سب سپاہی جمع ہو گئے۔ قاضی آ کر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ قاضی نے کہا "عورت ہندو ہو گی۔ اُسے پہلے اسلام میں لے آنا چاہئے۔ پھر نکاح ہو گا۔"

Scanned with CamScanner

"وہ مسلم ہی ہے اس سے دریافت کر لیجئے۔"

"نام کیا ہے؟"

"أما پاروتی۔"

"مسلم نام دوسرا ہونا چاہیئے۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے اس کی زبان عربی نہیں اس کا نام عربی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ نام اس کا یہی رہے کوئی فرق نہیں پڑتا دین اس کا اسلام ہمیشہ سے ہے۔"

قاضی صاحب تعجب سے ابن مسلم کو دیکھتے رہے اور کچھ نہ کہہ سکے۔

أما پاروتی کے پاس سپاہیوں کی تمام بیویاں آگئی تھیں۔ وہ اس دیوی کی صورت تھی جس کو وہ لوگ پوجتی آئی تھیں۔ وہ سب اس کے سامنے جھک گئیں اور اس کے لئے ہر خدمت کو تیار ہو گئیں۔ اس کو ہر طرح سے دلہن بنا دیا گیا۔

قاضی صاحب اس کے پاس آئے اور پوچھا۔ "أما پاروتی آپ مسلم ہیں؟"

"میں ہمیشہ مسلم تھی لا الٰہ الا اللہ میرا ہمیشہ سے قول اور عقیدہ تھا۔"

"اور محمد رسول اللہ کی بابت؟"

"جب سے رسول اللہ کا ظہور ہوا میں ان کو بھی ماننے لگی۔"

"آپ کس بت کو پوجتی تھیں۔"

"میں نے کبھی کوئی بت نہیں پوجا۔ اگر مجھے لوگوں نے بت بنا کر پوجا تو میری خطا نہیں ہے۔"

"تو آپ کو مسلم مان لیا جائے۔؟"

"میں آج کے دن کی منتظر تھی جبکہ میں مسلمین میں شامل ہو جاؤں۔"

"اچھا تو بتائیے کہ آپ اپنا نکاح ابن مسلم کے ساتھ بالعوض مہر شرعی قبول کرتی ہیں!"

"اس کے لئے میں کئی صدیوں سے منتظر تھی۔"

قاضی صاحب کو بڑا تعجب ہوا۔ وہ سمجھ گئے۔ یہ عورت کوئی جواز ادیں سے ہے اور اب ان کی سمجھ میں یہ بھی آگیا کہ اس کے اثر سے ابن مسلم بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ غرض وہ باہر آگئے اور محفل کے سامنے نکاح کا صیغہ پڑھ دیا۔ روزمرہ کی طرح دسترخوان بچھا۔ سب نے کھانا کھایا۔ اندر بھی ایک الگ دعوت ہوئی۔

آخر میں ابن مسلم اپنی بیوی کے پاس آیا۔ دونوں کھڑکی پر کھڑے ہو کر دریا کی طرف دیکھتے رہے۔ اکدم سے ابن مسلم نے باہر آکر حکم دیا کہ اس کا بجرا تیار کیا جائے۔ سب متعجب ہوئے سب کو اب یقین ہو گیا کہ وہ پاگل ہو گیا۔ مگر حاکم سے انکار کا سوال ہی نہ تھا۔ بجرا چلانے والے ملاح تیار ہو گئے۔ وہ پاروتی کو گود میں لئے ہوئے آکر بجرے کے عرشے میں بیٹھ گیا اور ملاحوں کو حکم دیا کہ ترینی پر بجرا چلائیں۔ رات بھر بجرا اسنگم کی لکیر پر چلتا رہا اور ابن مسلم اور أما پاروتی ہم آغوش رہے صبح کو ابن مسلم کی ہندوستان میں زندگی مکمل ہو کر ایک خاص ڈھرے پر چلنے لگی۔ اس کی انتظامی مصروفیات میں کوئی خلل نہ آیا بلکہ اس کے ذہن میں استقلال پیدا ہو جانے کی وجہ سے یہ سب کام بھی بہتر چلنے لگے مگر خالی وقت کو شکار وغیرہ میں گنوانے کے بجائے وہ اپنی بیوی کے پاس صرف کرنے لگا۔

اب محمد بن بختیار خلجی نے بہار اور بنگال بھی فتح کر لئے تھے سلطان قطب الدین ایبک نے اجمیر اور سندھ کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ بندھیلکھنڈ، اور گجرات کے حصے بھی دہلی سلطنت میں آ گئے تھے مسلم حکومت پورے ہندوستان پر قائم ہو گئی تھی سلطان قطب الدین ایبک کو سب سے زیادہ فکر پنجاب کی تھی کیونکہ غزنی کا بادشاہ اس کا دعوی دار تھا۔ اس لئے وہ زیادہ تر لاہور میں رہتا۔ دہلی سے مشرق کی طرف کے علاقوں کا اسے کوئی زیادہ خیال نہ تھا۔ ابن مسلم کا بادشاہ سے تعلق خراج روانہ کرنے سے زیادہ نہ رہا۔ وہ اپنے صوبے کا مقطع تھا اور اس کو ملک ابن مسلم کہا جاتا۔ اس نے اپنے صوبہ کے متعدد حصے کر دیئے تھے جن میں سے ہر ایک ایک فوجی سردار کے ماتحت تھا۔ اس سردار کے ساتھ ایک قاضی قانونی مسائل کو فیصل کرنے کیلئے

Scanned with CamScanner

اور ایک محاسب ہر قسم کے مالی کاموں کے لئے ہوتا تھا۔ گاؤں کے پرانے انتظام میں کوئی فرق نہ لایا گیا تھا۔ گاؤں کا مکھیا محاسب سے متعلق ہو گیا تھا اور پنچایتوں کو آخری فیصلے کے لئے ملتان کی طرف توجہ کرنا پڑتی تھی۔ ابن مسلم کے مخصوص فرائض یہ تھے کہ وہ فوج کی دیکھ بھال کرے۔ روز صبح نماز کے بعد وہ فوج کو قواعد کراتا۔ پھر کچھ عرصہ چاشت کا ہوتا۔ اس کے بعد ایک وقت دربار کے لئے بھی مقرر تھا جس میں متعدد اضلاع کے امور اس کے سامنے پیش ہوتے اور وہ ان پر احکام جاری کرتا۔ ظہر کی نماز تک دربار جاری رہتا۔ ظہر اور عصر کے درمیان وقفہ رہتا جو وہ پاروتی کے پاس گزارتا۔ عصر سے مغرب تک بیرونی کاموں میں صرف ہوتا۔ گشت قریب قریب روز کرتا۔ سپاہیوں کو مشقت کے کام دیئے جاتے اور ان کی دیکھ بھال بھی گشت کے وقت ہو جاتی۔ گاؤں اور شہروں میں گشت کے لئے بھی یہی وقت تھا۔ اکثر وہ گاؤں سے گزرتا تو کوئی داد چاہتا اور وہ اس کا کام نکال دیتا۔

رات کے وقت ہر طرح حفاظت کی بڑی ضرورت تھی کیونکہ ڈاکوؤں سے بڑا خطرہ تھا۔ ڈاکوؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان کو ختم کرنے کے لئے مرکز سے جنگلوں کی صفائی کا حکم دیا گیا۔ بہت سے جنگل جلا دیئے گئے اور بہت میں لکڑہاروں کے ساتھ فوج کے سپاہی بھی درخت گرانے میں مصروف رہتے۔ ڈاکوؤں کے جتھوں کو توڑ دیا جاتا اور ان کو گھروں میں رہ کر صاف شدہ زمین پر کاشتکاری کرنے کی آسانیاں بہم پہنچائی جاتیں۔ بہت سے نئے گاؤں وجود میں آئے جن میں مرکزی گھر کسی مسلم سپاہی کا تھا اور باقی آبادی ہندوؤں کی تھی۔ یہ سپاہی زمیندار کی سی حیثیت رکھتا تھا اور باقی لوگ اس کی رعایا تھے۔ زمیندار کی بیوی عموماً نو مسلم عورت ہوتی تھی جو اسلام قبول کر لینے کے باوجود ہندو معاشرت اور رسم و رواج کی پابند ہوتی تھی اور اس لئے گاؤں بھر کی عورتیں اس کو اپنی سرپرست سمجھتی تھیں۔

ابن مسلم کی بیوی بھی ایک خاص اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ محل کا آدھا حصہ اس کے قبضے میں آیا تھا۔ اس کو اس نے قناتوں کے ذریعہ بہت سے حصوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ ایک حصہ میں

حمام تھا اور وہ روز صبح حمام ضرور کرتی۔ ابن مسلم کو بھی حمام کی عادت پڑنے لگی تھی حالانکہ فوج کی قواعد کے سلسلے میں اکثر وہ حمام غائب کر جاتا۔ ایک حصہ باورچی خانہ ہو گیا تھا جس میں کئی عورتیں ہندوستانی کھانے پکاتیں۔ اب تک مسلم خمیری روٹی اور بھنا گوشت کھانے کا عادی تھا مگر اب وہ چپاتی، ترکاریاں اور ہر قسم کے ہندوستانی کھانے بھی کھانے لگا تھا۔ پاروتی مسالے دار کھانے بہت کھاتی۔ ابن مسلم بھی ان کو پسند کرنے لگا تھا۔ ایک حصہ کپڑوں کے لئے مخصوص ہو گیا تھا۔ یہ متعدد کپڑوں کے کام کرنے والیوں کے حوالے تھا۔ پاروتی خود کپڑے قطع کرتی اور سیتی۔ ابن مسلم نے عبا پہننا چھوڑ دیا تھا۔ قبا کو کافی چھوٹا کر دیا تھا اور اس میں بند لگا دیئے گئے تھے۔ عمامے کی جگہ صافہ یا محض ٹوپی نے لے لی تھی۔ گرمیوں میں وہ مہین سوتی کپڑے کے کرتے بھی پہنتا تھا اور مہین کپڑے کی ٹوپی بھی۔ پاروتی اکثر اس کو انگرکھا بھی پہناتی اور وہ پہن کر خوش ہوتا۔ محل کے سامنے بڑا وسیع باغ تھا جس میں ہر قسم کے پھل تھے اور ایک نہر تھی جس میں سنگم سے پانی آتا تھا۔ شام کو ابن مسلم اور پاروتی اس کے کنارے نہر پر چھوٹی کشتی کھیتے۔ چاندنی راتوں میں ساری رات بھر اسی باغ میں گزارتے۔ پاروتی کو بہت گیت یاد تھے۔ اور وہ ہر قسم کے باجے بجانا بھی جانتی تھی۔ اسے ناچ بھی آتا تھا۔ ابن مسلم اس کو گاتا، بجاتا، ناچتا دیکھ کر وجد میں آ جاتا۔ اُسے اٹھا لیتا۔ اُسے اچھالتا، اُسے سینے سے لگا کے بیٹے سی بچے جیسے سائے میں غائب ہو جاتا۔ کسی گھاس کے ٹکڑے پر گر جاتا۔ اکثر صبح کو پاروتی گھوڑے کی سواری کرتی اور ہتھیار چلانے کی بھی مشق کرتی۔ شکار میں اب وہ ابن مسلم کے ساتھ ساتھ اپنے گھوڑے پر نظر آتی۔ اس کا منہ ڈھکا ہوتا مگر وہ گھوڑے پر ڈٹی ہوئی بیٹھی ہوتی اور شہسواری کی مثال معلوم ہوتی۔ ابن مسلم کے ساتھ وہ گھوڑا دوڑاتی اور ابن مسلم جان بوجھ کر اس سے ہار جاتا۔ اس نے تیر پر تیر چلانا بھی سیکھ لیا تھا اور نشانہ بہت اچھا ہو گیا تھا۔)

اس کے اسی طرح دن گزر رہے تھے کہ ایک دن خبر آئی کہ سلطان قطب الدین ایبک چوگان کھیلتے کھیلتے گھوڑے پر سے گرا اور مر گیا۔ لاہور کے فوجی سرداروں نے اس کے لئے پالک بیٹے

Scanned with CamScanner

آرام شاہ کی بادشاہی کا اعلان کر دیا کچھ ہی دیر کے بعد ایک سوار شمس الدین صوبہ دار بدایوں کا خط لے کر آیا۔ اس کو پڑھ کر ابن جسلم نے فوراً فوجی لباس پہنا اور اپنے دستے کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ پاروتی نے پوچھا تو اس نے بتایا "کہ بدایوں کے صوبہ دار شمس الدین التمش نے آرام شاہ کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اور سب صوبیداروں سے مدد مانگی ہے۔"

"مگر تم آرام شاہ کے بجائے التمش کے ساتھی کیوں بن رہے ہو۔"

"التمش سب سے زیادہ ہوشیار اور قابل شخص ہے وہ حکومت حاصل کر کے رہے گا۔ جو اس کے خلاف جائے گا اس کی خیر نہیں۔"

"مگر یہ سلطان کا ہوتا کون ہے۔"

"غلام۔ بخارا کا رہنے والا تھا قطب الدین نے اسے خریدا تھا۔"

"اور آرام شاہ تو بیٹا ہے۔"

"بنایا ہوا بیٹا۔ مگر تم یہ نہیں دیکھتے قطب الدین بھی محمد غوری کا غلام تھا۔ قابلیت خاص چیز ہے۔"

"مگر قابلیت ثابت کرنے کے لئے ہر بار جنگ ضرور ہوگی۔"

"یہ تو ہوتا ہی آیا ہے ہماری تاریخ میں۔"

"ہاں یہی ہوتا چلے گا۔ مگر ہے یہ غلط۔ تباہی۔ کوئی قانون کوئی قاعدہ ہونا چاہیئے۔"

"جانے دو۔ تم سب انتظام سنبھالنا۔ میں چلا۔"

ابن جسلم اپنی فوج کے ساتھ بدایوں پہنچا۔ یہاں شمس الدین کے ساتھ بہت سے سردار مع اپنی فوج کے ملے۔ کثیر فوج نے دلّی کی طرف کوچ کیا۔ دلّی کے اندر تمام سرداروں نے پہلے ہی شمس الدین کو سلطان بنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ فوج شہر میں داخل ہو گئی اور قلعہ میں شمس الدین التمش بادشاہ کی حیثیت سے داخل ہوا۔

دوسرے دن اس نے دربار خاص کیا۔ ایک بڑے سے بڑے دالان میں جس میں کوئی سجاوٹ

نہ تھی ایک طرف اونچا تخت بچھا تھا اس پر سلطان جلوہ افروز ہوا۔ اس کا لباس سادہ تھا۔ سر پر تاج بھی نہ تھا مگر اس کے چہرہ پر وہ رعب تھا جو اسے سب سے ممتاز کرتا تھا۔ اس کے داہنے اور بائیں ایک قطار میں نیچے تختوں پر چالیس سردار بیٹھے تھے۔ یہ سب محمد غوری یا قطب الدین کے محبوب غلام تھے ان میں سے ہر ایک تجربہ کار سپاہی اور منتظم تھا۔ ان کے چہروں کی بردباری ان کی علویت کا پتہ دیتی تھی۔ سامنے تمام صوبیدار اور سردار بیٹھے تھے ایک طرف ایک تخت پر شاہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بیٹھے تھے۔ نورانی چہرہ لمبی سفید داڑھی آنکھیں جھکی ہوئی لب پر ذکر جاری ہاتھ میں تسبیح تھی ان کے پاس زمین کے فرش پر مورخ ناصری منہاج السراج۔ مورخ نثر نگار صدرالدین محمد حسن نظامی۔ مورخ ادب نورالدین عوفی۔ شاعر ناصری، سدحاق۔ جمہرہ بدایونی بیٹھے تھے۔ باہر فوج آراستہ کھڑی تھی۔

سلطان شمس الدین کے پاس حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ تشریف لائے سب اٹھ کھڑے ہوئے انھوں نے سلطان کے سر پر ہاتھ رکھ کر تلاوت کلام پاک کی پھر جا کر اپنے تخت پر بیٹھ گئے۔ سب نے سورۃ الملک پڑھی۔ ناصری نے قصیدہ گزرانا۔ اس نے مطلع اٹھایا:

اے فتنہ از نہیب تو زنہار خواستہ

تیغ تو پیل و مال ز کفت زخواستہ

محفل وجد میں آگئی قصیدہ تریسٹھ شعروں کا تھا سلطان نے فی شعر ایک ہزار تنکہ کا انعام دیا۔

پھر سلطان نے اپنے چالیس ساتھیوں کے نام لئے اور کہا کہ عنان حکومت ان کے ہاتھ میں ہوگی اور ان ہی کی رائے سے تمام کام سرانجام ہوں گے ان ہی کو سلطان کے انتخاب کا بھی حق ہوگا۔ پھر قاضی شہر صدرالصدور کو تو ال شہر کے تقرر کے لئے تمام پیش ہوئے اور مجلس شمسی نے انھیں منظور کیا۔ دعوت ہوئی اس میں کوئی شراب نہ تھی۔ فوج میں انعامات تقسیم ہوئے اور غربا کے لئے لنگر جاری کیا گیا۔

Scanned with CamScanner

دربار سے الگ ہو کر ابن مسلم شہر کے اندر آیا۔ دلی دیکھے ہوئے اسے عرصہ ہو گیا تھا۔ شہر بڑھ رہا تھا اور صنعت و حرفت کا مرکز ہو رہا تھا۔ بازار بہت بڑھ گیا تھا اور اس میں ہر طرح کے کاریگروں کی دکانیں تھیں۔ کپڑے کی تجارت زیادہ فروغ پر تھی۔ مختلف قسم کی آرائش کے سامان بھی تیار ہونے لگے تھے۔ اُمراء نے بڑے بڑے محل تعمیر کرا لئے تھے جن میں عیش و تفریح کے سامان مہیا ہوتے جاتے تھے۔ وہ قطب الدین بختیار کاکی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مریدوں کا کافی ہجوم تھا۔ جمعرات کی رات کو سماع میں بھی شریک ہوا۔ غزلیں گائی گئیں۔ لوگ حال میں آ گئے۔ قریب ہی قطب مینار پر بھی چڑھا۔ ہندو راجاؤں کے زمانے کی منزلوں پر تین نئی منزلیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف ایک اور مینار کی بھی بنیاد رکھی جا چکی تھی جس کو اس مینار سے دگنا اونچا بنانے کا ارادہ تھا۔ قطبی مسجد کا چبوترہ پورا ہو چکا تھا اور اس پر کچھ محرابیں بھی کھڑی کی جا چکی تھیں۔

وہ منہاج السراج سے ملا جو معلومات حاصل کرنے کے لئے سفر کرنے والے تھے۔ اس نے عرض کی "حضور پریاگ میں غریب خانے پر ضرور تشریف لائیں۔" انھوں نے آنے کا وعدہ کیا اور کہا "طبقاتِ ناصری کے لئے آپ کے یہاں بہت مواد مل جائے گا۔"

وہ صدر الدین محمد بن حسن نظامی سے بھی ملا۔ وہ مناظر قدرت کے بڑے دلدادہ تھے۔ سنگم کا حال سن کر بے اختیار بولے۔ "تاج المعاصرین میں سنگم کا بیان ضروری ہے میں ضرور آؤں گا۔"

شاعروں سے ملنے کو اس کا جی نہ چاہا۔ وہ قلعہ کو واپس آ رہا تھا تو ایک جگہ اس نے نیچے درجے کے ہندوؤں کو ناچتے دیکھا۔ باجا بج رہا تھا۔ نہایت بے ہنگم باجا تھا مگر اس میں عجیب کیف تھا۔ عورتیں گا گا کر ناچ رہی تھیں۔ اسے اپنی پاربتی یاد آئی۔ اس کا جی چاہا کہ فوراً گھر واپس پہنچ جائے۔ مگر بغیر سلطان کی اجازت کے واپسی ناممکن تھی۔

صبح کو وہ اٹھا تو فوج کا طبل بج رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ آرام شاہ فوج لئے آ رہا ہے۔ سلطان خود سالار فوج ہوا اور اس کے پیچھے کثیر فوج چل کھڑی ہوئی۔ دلی سے کچھ ہی دور پہنچی ہوگی کہ آرام شاہ سے مقابلہ ہوا جس کی فوج ایک ہی معرکہ میں پسپا ہو گئی۔ آرام شاہ مارا گیا۔ فتح کے

جھنڈے لہراتی ہوئی فوج دلی واپس آئی۔

سلطان شمس الدین التمش کو یہ خبر ملی کہ بنگال میں خلجیوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ علی مردان خاں خلجی تھا جس نے آزاد و بادشاہ کہلوا لیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اطلاع ملی کہ لاہور میں تاج الدین یلدوز اور سندھ میں قباچہ نے بھی خود مختاری اختیار کر لی۔ التمش نے اپنی توجہ لاہور اور سندھ کی طرف دی۔ ابن مسلم اور دیگر صوبہ داروں کو فوراً اپنے اپنے مقامات پر پہنچ جانے کا حکم دیا۔ ابن مسلم سے خاص طور سے کہا: "تمہارے صوبے سے بنگال قریب ہے شر کے وہاں تک پہنچ جانے کا بہت امکان ہے تم فوراً جاؤ اور آگے احکام کا انتظار کرو۔"

ابن مسلم کی دلی مراد مل گئی۔ وہ فوراً ہی اپنی فوج کے ساتھ کوچ کر گیا۔ دلی کے بازار سے گزرتے ہوئے اس نے پاربتی کے لئے بہترین کپڑے اور بہترین زیور خرید لئے۔ اپنے لئے بھی ویسے کپڑے خریدے جن کو اسے پہنا کر پاربتی خوش ہوا کرتی تھی۔ جلدی جلدی منزلیں طے کرتا ہوا آخر کو وہ پاربتی کے پاس پہنچ گیا۔ اس رات کو چاندنی میں گھاس پر پاربتی نے اس کے لائے ہوئے کپڑے پہن کر شکتی ناچ ناچا۔ دیوالی کا تہوار تھا۔ پورے محل پر دیئے جلائے گئے تھے۔ ان کی روشنی نہر میں کھیل رہی تھی۔ ابن مسلم بالکل راجپوتوں کے لباس میں آ کے بیٹھا تھا۔ ہاتھ پر جلتے ہوئے دیوں کا طباق لئے ہوئے پاربتی ناچ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں، اس کی مسکراہٹ، اس کا نور عجیب کرشمہ نظر آیا۔ اس کے گیت کے بول

"آج مورے جوبن میں آئی بہار"

نے ابن مسلم کو گم کر دیا۔

"ناچو ناچو پیارے من کے مور"

کی تکرار نے اس کے دل کو کیف سے نچا دیا۔

۳

مگر وہ سپاہی تھا اور وہ بڑا آشوب تھا۔ اس کے سلطان نے اسے ہر وقت تیار رہنے
کی ہدایت کی تھی۔ پاروتی بھی سپاہی کی بیوی تھی وقت پڑنے پر اسے بھی جنگ کرنا تھی۔ فوج کو ہر
وقت مستعد رکھنے میں دونوں مصروف رہے۔ پورے ہندوستان کی خبروں سے واقفیت ان
کا پہلا کام تھا۔ التمش نہایت ہوشیار بادشاہ تھا اور لڑائی سے زیادہ سیاست سے کام نکال لینا
جانتا تھا اور جانتا تھا۔ ابن مسلم جانتا تھا کہ التمش کو یلدوز اور قباچہ پر پہلے قابو حاصل کرنا تھا۔ اس
نے سنا کہ سلطان نے یلدوز سے دب کر صلح کر لی مگر کچھ ہی عرصے کے بعد غزنی کو خوارزم شاہ کے فتح کرنے
کی خبر آئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یلدوز غزنی سے بھاگ کر پنجاب آیا اور دہلی پر حملہ کرنے کے لئے ستلج کو پار کیا۔
ترائن کے مقام پر التمش نے اس کو شکست دی اور قید کر کے بدایوں پہونچا دیا۔ اس کے بعد ہی قباچہ
لاہور کا مدعی ہوا اور اسے بھی سلطان نے بیاس کے کنارے شکست دی مگر قباچہ کے پاس پنجاب کا
کافی حصہ اور سندھ باقی رہا۔ پھر خبر ملی کہ نانا پاروتی کے جو عزیز راجپوتانہ میں جا بسے تھے ان کو قابو
میں لانے کے لئے سلطان نے رنتھمبور اور منڈور کے قلعے فتح کئے۔

ایک دن یہ خبر آئی کہ سلطان کا لڑکا ناصر الدین جو اودھ کا صوبہ دار تھا فوج لے کر
بنگال روانہ ہو رہا ہے۔ ابن مسلم کو مع اپنے دستے کے اس کے ساتھ جانے کیلئے تیار ہو جانا چاہئیے۔ بنگال

الی مردان خلجی کو اس کے امراء نے قتل کر کے حسام الدین خلجی کا انتخاب کیا تھا جس نے سلطان
غیاث الدین کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ اس کا بہار کے سلطانی صوبہ داروں سے جھگڑا ہوا۔ اس موقع
فائدہ اٹھا کر ناصر الدین نے اپنی فوج کو کوچ کا حکم دیا۔ وہ بنگال پہنچا تو ابن مسلم بھی اس کے ساتھ
لیا۔ پوری فوج نہایت تیزی سے بڑھتی ہوئی لکھنوتی پہنچی اور غیاث الدین کو مع اس کے حامیوں
کے گرفتار کر لیا۔ ناصر الدین بنگال کا حکمراں ہو گیا۔ ابن مسلم اپنی پاروتی کے پاس واپس آیا۔
دوسرے سال اسے اطلاع ملی کہ التمش نے قباچہ کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد ہی خلیفہ بغداد
ے کشور ہند کی سند التمش کو ملنے کا موقع آیا۔ التمش نے جشن منانے کے سامان کئے اور سب صوبہ
داروں کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دی۔

ابن مسلم اور نانا پاروتی دونوں دہلی پہنچے۔ ان کی زندگی میں پہلی دفعہ تزک احتشام اور
و حشم کا تجربہ ہوا۔ مسلمان بادشاہ اور سردار پر تکلف زندگی سے ناواقف تھے۔ ہندو دیوالی
کے موقع پر اپنے گھروں اور گاؤں کو سجاتے تھے۔ اب ان ہی کی مدد سے دلی کو سجایا گیا۔
ب رنگی چتوں اور پھولوں کے بندھنوار بازار کی شاہراہ پر لگائے گئے۔ مکانوں کو بھی ان ہی
سجایا گیا۔ جگہ جگہ پھاٹک کھڑے کئے گئے۔ ان کے اوپر جھنڈے لٹکائے گئے۔ سنہرے کپڑوں پر
دار کپڑوں سے حروف کاٹ کر لگائے گئے۔ "فتح سندھ" "فیض امیر المومنین" زیادہ تر پھاٹکوں
لکھا نظر آیا۔ دکانداروں نے اپنی اپنی دکانیں الگ الگ سجائیں۔ امیر المومنین کا سفیر جلوس کے
تھ شہر میں داخل ہوا۔ سب میں آگے ہاتھیوں کی ایک قطار تھی۔ اس کے بعد اونٹوں کی۔ اس کے
گھوڑوں کی اس کے بعد پیادوں کی۔ سب سے آخر میں ایک ہاتھی پر سفیر جلوہ افروز تھا۔ اس
سامنے ایک آدمی وہ سامان لئے ہوئے دکھایا جا رہا تھا جو خلیفہ کی طرف سے آیا تھا۔ جلوس
پر پہنچ گیا۔

قلعے کے دروازے پر سلطان خود استقبال کیلئے کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے سردار تھے ......
لم نے دیکھا کہ قلعے کے اندر بھی اسی قسم کی سجاوٹ تھی جیسی کہ شہر میں صرف یہ زیادہ تھا کہ پھاٹک

Scanned with CamScanner

سے دیوار تک دو رویہ سرو کے درخت لگ گئے تھے جن کی چوٹیوں پر چراغ رکھے ہوئے تھے۔ دربار گاہ
اب بہت زیادہ آراستہ تھا۔ راستے چھوڑ چھوڑ کر تختوں کے چوکے بچھے ہوئے تھے۔ بادشاہ کے لئے چاندی
سونے کا گنگا جمنی سنگھاسن تھا۔ سفیر اور بادشاہ اس میں جا بیٹھے۔ سب سرداروں نے اپنی
اپنی جگہیں لے لیں۔ ابن مسلم کو صوبہ داروں میں جگہ ملی۔ سفیر نے امیر المومنین کا فرمان پڑھا اور ایک
عبا نکال کر التمش کو پہنایا۔ شادیانے بجنے لگے۔ دور پر گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ سرداروں
نے ایک تاج پیش کیا جس کو سفیر نے سلطان کے سر پر رکھا۔ التمش ہندوستان کا سلطان
اور اسلام کا نمائندہ مان لیا گیا۔ اسلامی حکومت میں پہلی دفعہ سرود کا قلعہ میں ورود ہوا۔ گانے
والے بھانڈ اور رنڈیوں نے قلعہ کے صحن میں اپلش کے گیت گائے۔ ہندوستان کی ہر قوم
کے لوگ اپنے اپنے باجے لے کر آئے تھے اور انھوں نے ان باجوں کو بڑے جوش کے ساتھ بجایا۔

دسترخوان ہوا۔ اس میں بہت قسم کے ہندوستانی کھانے تھے۔ صحن میں ایک مقام پر
فوجی کرتب اور لوک ناچ اور مختلف قسم کے کھیل دکھائے گئے۔ سلطان نے اپنے ہاتھ سے انعام
دیئے۔ قلعہ عوام کے لئے کھلا تھا۔ لاتعداد غربا صحن کے ایک حصہ میں جمع تھے۔ ان کو لنگر بٹا۔ گیا اور
ٹکے لٹائے گئے۔ رات میں پورے شہر میں چراغاں ہوئی۔ مسلمانوں کی عملداری میں ہندوؤں کو بھی کھل کر
چراغاں کرنے کا یہ پہلا موقع ملا تھا۔

قلعہ کے اندر سلطان کی بڑی چہیتی لڑکی رضیہ کو پاروتی سے خاص لگاؤ ہو گیا تھا۔ اس
نے تمام انتظام پاروتی کے سپرد کر دیا تھا۔ پاروتی نے شہزادی کو سجانے میں خاص دلچسپی لی تھی اور
اس کو تمام راجپوت زیوروں اور کپڑوں سے آراستہ کیا تھا۔ پاروتی اور دوسری عورتوں نے
تیراندازی، تیغ زنی اور سواری کے کرتب دکھائے۔ پاروتی نے ایک ملازمہ کی نتھ میں سے
تیر چلا کر دکھایا۔ اس پر قلعہ کی تمام خواتین اس کی فریفتہ ہو گئیں۔

جشن کئی دن تک رہے مگر اکدم سے سلطان کے عزیز ترین صاحبزادے ناصر الدین کی
بنگال میں وفات کی خبر آئی۔ تمام جشن ختم ہو گئے۔ صف ماتم بچھ گئی۔ سلطان کے تعلق کی کوئی انتہا

نہ رہی۔ سلطان نے خلیفۃ المسلمین کے سفیر کو گراں بہا تحائف دیکر واپس کیا۔

بنگال میں شورش کی خبر آئی۔ سلطان مشرقی صوبوں کے تمام سرداروں کو ساتھ لے کر خود
روانہ ہوا۔ لڑکے کے غم سے ٹوٹے ہوئے دل کو بہلانے کا اُسے یہ شغل مل گیا۔ ابن مسلم اس کے ساتھ گیا
اور پاروتی شاہزادی رضیہ کے ساتھ رہی۔ دونوں میں ایک عجیب قسم کی انسیت ہو گئی تھی۔ دونوں
صبح ساتھ ساتھ گھوڑوں پر سوار نظر آتیں۔ گھوڑے دوڑاتیں۔ تلوار کے ہاتھ چلاتیں۔ تیراندازی کرتیں۔
ساتھ کھانا کھاتیں، ساتھ کھیلتیں۔ رضیہ میں مردانی صفات کچھ ضرورت سے زیادہ تھیں۔ وہ
مرد بننا چاہتی تھی۔ وہ اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ ذہین تھی اور قابل بھی۔ وہ سلطنت کا خواب
دیکھتی تھی اور اس نے اپنے دل کا یہ راز پاروتی سے بتا دیا تھا۔ شام کے وقت اکثر وہ مردانے کپڑے
پہنتی اور نہر کے پاس آکر بیٹھتی۔ پاروتی زنانے کپڑے پہنے ہوئے اس کے سامنے ناچتی۔ پھر دونوں
ناٹک کھیلنے لگتیں۔ معلوم ہوتا کہ دونوں میں عشق بازی ہو رہی ہے۔ یوں ہی دن کٹ گئے اور
سلطان دارالسلطنت پر واپس آیا۔ اب اس کو رضیہ سے اور بھی زیادہ محبت ہو گئی تھی۔ پاروتی
نے رضیہ سے کہا کہ سلطان سے اپنے تئیں جانشین مقرر کروالے۔ سلطان بھی پاروتی کی طرف خاص
توجہ کرنے لگا تھا۔ رضیہ نے ایک دن سلطان کو تیراندازی کا وہ کرتب دکھایا جو پاروتی نے اُسے
سکھایا تھا۔ سلطان بہت خوش ہوا اور منہ مانگا انعام دینے کو کہا۔ رضیہ خاموش رہی۔ پاروتی
اشارے کرتی رہی۔ آخر کو رضیہ نے باپ سے لپٹ کر کان میں کہا: "میرا انعام سلطنت ہے۔" سلطان
نے پاروتی پر نگاہ جما کر کہا "میرے بچوں میں سب سے زیادہ ہونہار اور قابل رضیہ ہی ہے۔"

دوسرے دن دربار میں بھی سلطان نے اعلان کیا: "میرے بعد میری لڑکی رضیہ کو اگر آپ
سلطانہ مقرر کریں تو بہتر ہوگا۔ میرے چھوٹے بچوں سے زیادہ اہل آپ اس کو پائیں گے۔" یہ خبر جب
قلعہ میں آئی، پاروتی اور رضیہ ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ ابن مسلم کی پاروتی سے کبھی کبھی ہی
ملاقات ہو جاتی۔ وہ عہدے پر واپس گیا مگر پاروتی کو رضیہ نے نہ جانے دیا۔ سلطان زیادہ تر مالوہ
گوالیار، بھیلسا اور اجین کو فتح کرنے میں مصروف رہا۔ اس کی عدم موجودگی میں رضیہ حکومت کا

کام بھی دیکھتی اور پاروتی اس میں بھی اس کی مدد کرتی۔

آخر سلطان کا انتقال ہو گیا۔ اس کی مجلس نے جس کو ترکان چہل گانی کہا جاتا تھا اس کے منجھلے بیٹے رکن الدین کو سلطان منتخب کیا۔ رضیہ کو بڑا صدمہ ہوا مگر پاروتی اسے دلاسا دیتی رہی۔ چھ ماہ کے اندر ہی رکن الدین نااہل ثابت ہوا اور آخر کو ترکان نے اسے معزول کر کے رضیہ کو سلطانہ بنایا۔ اس کے بھائی اور بہت سے سرداروں کو یہ ناگوار گزرا مگر رضیہ کی فراست اور شجاعت سے وہ بھی مرعوب ہو گئے۔ عرصے تک دشمنوں نے رضیہ کو معزول کرانے کے بہانے ڈھونڈے مگر آخر کو ایک بات پکڑ پائی۔ رضیہ نے پردہ اٹھا دیا تھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر فوج کا جائزہ لیا کرتی تھی۔ اگر اسے گھوڑے پر چڑھنے میں زحمت ہوتی تو اس کا حبشی غلام یاقوت اسے اٹھا کر گھوڑے پر بٹھا دیتا۔ اس پر لوگوں نے پھبتیاں چھوڑیں اور افواہیں اڑائیں۔ ان کی خبر پاروتی کو پہنچی۔ اس نے ٹال جانے کا مشورہ دیا۔ یاقوت اصطبل کا داروغہ تھا مگر کیونکہ سلطانہ کو اس کی ضرورت پڑتی تھی اس لئے اس نے اس کو امیر کا منصب دے دیا۔ امیروں نے برا مانا مگر ملکہ کے رعب کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکے اور اپنے اپنے منصبوں پر واپس گئے۔ سلطانہ کو اب اپنا رعب جمانے کے لئے یہ سوجھی کہ یاقوت کو امیر الامراء کا منصب دے۔ پاروتی نے سمجھایا کہ ایسا کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ مگر سلطانہ نہ مانی۔ اس نے دربار میں یاقوت کی امیر الامرائی کا اعلان کر دیا۔ ادھر فوج شاہی کے ترک سردار بگڑ گئے ادھر بھٹنڈہ سے التونیہ نے سر اٹھایا۔ سلطانہ فوج لے کر اس کو دبانے چلی۔ پاروتی بھی سپاہی کے لباس میں اس کے ساتھ تھی۔ ایک رات فوج پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی کہ ترک سواروں نے یاقوت کو مار ڈالا اور سلطانہ کو قید کر لیا۔ دوسرے دن دلی میں معز الدین بہرام شاہ کی سلطنت کا اعلان ہو گیا۔

پاروتی کی ترکیبوں سے رضیہ قید سے نکل بھاگی۔ دونوں بھٹنڈہ پہنچیں۔ رضیہ نے التونیہ سے شادی کر لی اور دلی پر چڑھائی کی۔ رہتک کے مقام پر جنگ ہوئی۔ التونیہ اور رضیہ مارے گئے۔ فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ پاروتی نے سنگم کا راستہ لیا۔ راستے میں کسی کو شبہ بھی نہ ہوا کہ

عورت تھی برابر سفر کرتی ہوئی آخر وہ اپنے شوہر کے قلعہ کے دروازے پر پہنچی۔ محافظ نے اندر جانے سے روکا۔ اس نے ابن مسلم سے ملنے کی سخت ضرورت کا اظہار کیا۔ وہ ابن مسلم کے سامنے پہنچائی گئی۔ اس نے اپنے سر کی پگڑی اتار دی۔ ابن مسلم جس کے لئے تڑپ رہا تھا۔ فوراً بڑھ کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ دونوں نے یہ طے کیا کہ دلی کے حالات سے بالکل بے خبر ہو کر اپنے عیش میں زندگی گزاریں گے۔

دلی میں افراتفری کی وجہ سے اہل علم منتشر ہونے لگے۔ منہاج السراج بنگال کی طرف جاتے میں ابن مسلم کے پاس ٹھہرا اور دلچسپی میں پھر ٹھہرا۔ اس نے سلطان غیاث الدین کی حکومت کے حالات جوش کے ساتھ بیان کئے۔ صدر الدین حسن نظامی کچھ زیادہ دن ٹھہرا۔ ابن مسلم اس کو اپنے بجرے میں بٹھا کر سیر کرانے لے گیا۔ نظامی سنگم سے بہت متاثر ہوا۔ وہ ایک دفعہ اورنگا پر سیر کو گئے۔ دریا رخ کے مندر تک پہنچ گئے۔ ابن مسلم نے دیکھا کہ مندر توڑ ڈالا گیا ہے۔ اوپر کا حصہ غائب ہے اور دیواریں چھوٹی کر دی گئی ہیں۔ اس نے دریافت کرایا تو معلوم ہوا کہ پاروتی کی مورتی کے غائب ہو جانے کے بعد ہندوؤں نے اس مندر کو توڑ ڈالا اور اس کا کلس جس میں سونا تھا نکال کر لے گئے۔ قریب میں ایک گاؤں مسلمانوں کا آباد ہو گیا تھا۔ انھوں نے دیواروں کو جہاں تک ان پر بت بنے تھے وہاں تک توڑ ڈالا اور اب اسے مسجد کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اس گاؤں کے مسلمانوں نے مسجد کا گنبد اور مینار بنوانے کے لئے مدد مانگی۔ ابن مسلم نے اپنے معمار وہاں بھجوا دیے۔ اس معاملہ کی خبر پاروتی کو ہوئی اس نے خود آ کر دیکھا اور مندر کو بالکل ختم کر کے بڑی مسجد تعمیر کرانے کا حکم دیا۔ مندر میں اتنا دفینہ نکلا کہ اس سے مسجد تعمیر ہو گئی۔

✲

ابن مسلم اور پاروتی اب زیادہ تر گاؤں بسانے اور زراعت کو فروغ دینے کے کام میں لگے۔ بہار شاہ کے زمانے سے لے کر بلبن کے عہد تک مغلوں کے طوفان کے بعد طوفان آتے رہے۔ سلاطین یا تو ان میں منہمک رہے اور یا عیاشی کرتے رہے۔ نظام الدین اولیا نے خلفا اول۔ [illegible] کو دوآب کے اضلاع میں بھیجا۔ یہ ابن مسلم کے آباد کئے ہوئے گاؤں میں آ بسے۔ ہر گاؤں میں ایک [illegible]

Scanned with CamScanner

دکھائی دیا اور اس کے مریدوں میں مسلمان اور ہندو دونوں نظر آئے۔ بھگتوں کی بھی تعداد نظر آئی۔ رام اور رحمن ایک ہے کی صدا پھیلنا شروع ہوئی۔ امیر خسرو نے قوالی کا راگ ایجاد کیا۔ اور وہ اس قدر مقبول ہوا کہ ہر شب جمعہ ہر گاؤں میں اس گاؤں کے ولی اللہ کے سامنے قوالی ہوا کرتی۔ امیر خسرو کی غزلیں اور دوہے گائے جاتے۔ ابن مسلم نے اپنے ملازمین میں قوالوں کے ایک طائفے کو بھی رکھ لیا۔ ہند و مسلم تہذیب کی آمیزش کا دور شروع ہوا اور ایک زبان وجود میں آنے لگی جس کا اب تک کوئی نام نہیں رکھا گیا تھا۔ ابن مسلم اور پاروتی آپس میں ایسی ہی کچھ زبان بولتے آئے تھے لیکن تمام مسلمان سپاہی اپنی بیویوں سے بھی بولتے تھے گھروں سے اب وہ نکل کر بازاروں میں آنے لگی۔ ہر گاؤں میں ایک مسجد ضرور ہوتی جو مدرسہ کا بھی کام دیتی۔ صوفیہ نے محض توحید پر ہندوؤں کی رسموں کو اپنایا۔ اس کی بنا پر ذہین ہندو بھی مسجدوں میں تعلیم کے لئے آنے لگے اور عربی فارسی کتاب میں کمال حاصل کر کے اکثر سرکاری کاموں میں بھی لگے۔

ابن مسلم اب زمیندار زیادہ اور سپاہی کم ہوتا جا رہا تھا۔ سپاہیوں کا انتظام اس نے ایک منتظم کے سپرد کر دیا تھا اور خود دن چڑھے باہر آتا۔ دیگر انتظامات بھی ایک محاسب کے سپرد کر دیئے تھے اور اپنا وقت زیادہ تر گھر کے اندر آما سے باتیں کرنے میں گزارتا۔ آما تخت پر گاؤ تکیہ سے لگی بیٹھی ہوتی وہ اس کے زانو پر سر رکھے لیٹا ہوتا۔

"دلی کے سلطان عیاشی میں پڑ رہے ہیں"۔ پاروتی کہتی۔

"نہیں بہرام شاہ عیاش تھا۔ علاؤ الدین مسعود بھی۔ مگر اب ناصر الدین محمود تو بڑا پاکباز ہے نہایت سادہ زندگی بسر کرتا ہے۔ اپنی بسر کے لئے قرآن مجید لکھ کر ہدیہ کرتا ہے۔"

"مگر سپاہی نہیں ہے منتظم نہیں ہے۔ کام اس کا وزیر بلبن کرتا ہے۔"

"بلبن تو سپاہی ہے۔ مغول کے حملوں کے لئے ہر وقت مستعد ہے۔"

"مگر ظالم ہے اور شان و شوکت میں مست۔"

"شان و شوکت ضروری ہے۔ سلطان کا رعب نہ ہو تو۔"

"ہمارے پرانے راجہ پرجا کے ساتھ ہولی کھیلتے تھے۔"

"ہمارے خلفا بھی عوام سے ملے جلے رہتے تھے۔ یہ چل نہ سکا۔"

"جانے دو اب ہمارا اور تمہارا مذہب ایک ہو جائے گا۔ یہ بھگتی اور صوفی کیسا میل جول کر رہے ہیں۔"

"ہندوؤں کی رسموں کو ہم قبول کر رہے ہیں۔ وہ ہماری توحید کو مان رہے ہیں۔ یہ قوالی محفل سماع خوب ہے۔ اس میں دونوں شریک ہو لیتے ہیں۔"

"بہت ہندوؤں نے بت پرستی کم کر دی۔"

"مسلمان بھی نماز روزہ سے بے بہرہ ہو کر صوفیہ کی کرامات میں مست ہو رہے ہیں ...... آج کچھ نئے قوال آئے ہیں ان کو سنو گی؟"

"ہاں۔ ان سے کہنا امیر خسرو کے گیت ضرور گائیں۔ کیوں۔"

"مگر تمہارے گانے اور ناچ میں اور ہی لطف ہے۔"

"میں نے اب بہت سی لڑکیاں سکھا رکھی ہیں۔ ایک دن سب مل کر ناچ دکھائیں گی۔"

"مگر تم نے مجھے بتایا نہیں۔"

"وہ لڑکیاں بڑی حسین ہیں۔ تمہیں کوئی پسند آ جاتی۔"

"تمہیں یہ شبہ ہے تو ابھی بلا کر امتحان کر لو۔"

"میں نے ویسے ہی کہا"

"نہیں ان کو ابھی بلاؤ۔"

تھوڑی دیر میں دس جوان لڑکیاں۔ لہنگے۔ کرتیاں پہنے۔ دوپٹے سروں پہ ڈالے۔ سینے ابھرے ہوئے۔ پیروں میں گھنگھرو۔ سروں پر جھمکے۔ کپڑوں میں لچکا اور تارے ٹکے ہوئے سامنے آ کر مجرا دینے لگیں۔ ابن مسلم آما کے پاس گاؤ سے لگ کر بیٹھ گیا تھا اور ان سب کو محو ہو کر دیکھنے لگا تھا۔ ہر ایک اس کے دل کو بھا رہی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ہر ایک کو اٹھا لے مگر وہ

اپنے جذبات چھپانے کے لئے بار بار آما کو دیکھتا۔ آما کے دل کو وہ نہیں دکھا سکتا تھا۔

لڑکیاں ناچ کر چلی گئیں تو اس نے کہا: "تم سے اچھی کوئی ہے ان میں اور پھر یہ محض جانور ہیں تم رانی ہو کتنی تہذیب یافتہ کتنی ذہین۔"

مگر اس رات جب کرشن ناچ ہوا اور یہ سب لڑکیاں۔ آما اور ابن مسلم کے چاروں طرف جو رادھا اور کرشن بنے تھے ناچنے لگیں تو وہ آما کو چھوڑ کر ہر ایک کے ساتھ ناچا، ہر ایک کو چپٹاتا رہا۔ آما بیچ ہی میں کھڑی مرلی بجاتی رہی۔ ابن مسلم کو مرلی بجانا نہیں آتی تھی اس لئے اس کے بجائے اس کی رادھا مرلی بجاتی۔ روز یہ ناچ ہوتا اور روز ابن مسلم ان لڑکیوں کے ساتھ ناچتا۔ آما کو خود بھی برا نہ لگتا۔ ابن مسلم کا دل ان لڑکیوں کی طرف سے بھرنے لگا۔

اس اثنا میں بنگال میں طغرل کی بغاوت کی خبر آئی۔ بلبن کا حکم آیا کہ مشرقی صوبوں سے افواج روانہ کی جائیں۔ ابن مسلم نے اپنا دستہ بھی بھیجا مگر خود اپنے عیش میں محو رہا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد اس کا دستہ شکست کھا کر واپس آیا۔ کچھ عرصے کے بعد بلبن کا سخت حکم آیا۔ ابن مسلم کا دستہ پھر بغاوت فرو کرنے والے لشکر میں شامل ہوا مگر پھر شکست کھا کر واپس آیا۔ بلبن اب بوڑھا ہو گیا تھا اور بیمار رہتا تھا مگر وہ آہنی ارادہ کا انسان مشہور ہو چکا تھا۔ وہ خود دلی سے لشکر لے کر چلا۔ راستے کے تمام صوبہ داروں کو ساتھ چلنے کے لئے تیار ہونے کا حکم ہو چکا تھا۔ بلبن کا لشکر سنگم کے پاس سے گزرا تو ابن مسلم خود اپنی فوج کے ساتھ اس سے جا ملا۔ برسات کا موسم تھا۔ راستوں میں کیچڑ کی وجہ سے بڑی دقتیں پیش آئیں۔ دریاؤں میں طغیانیاں آگئیں تھیں۔ ان کو پار کرنا اتنا دشوار تھا کہ ابن مسلم کی ہمت ہار گئی۔ آخر کار وہ لاکھ کا لشکر لکھنوتی کے قریب پہنچا۔ طغرل فرار ہو گیا۔ مگر بلبن نے اس نمک حرام غلام کو پکڑ لانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ لشکر بنگال کے چپے چپے میں پھیلا دیا گیا۔ چھ مہینے کے بعد ابن مسلم کے دستہ کو ایک پڑاؤ دکھائی دیا۔ اس کے پاس پہنچ کر شاہی سپاہیوں میں سے ایک نے طغرل کو پہچانا۔ طغرل بھاگا مگر ابن مسلم نے تیر جو چلایا جو اس کے ایسا لگا کہ وہ گھوڑے سے زمین پر آ رہا۔ اس کے ساتھیوں میں کچھ لڑتے ہوئے مارے گئے اور کچھ گرفتار کر لئے گئے۔

تمام لشکر لکھنوتی میں بلبن کے پاس جمع ہوا۔ شہر کے بازار میں دو رویہ سولیاں لگا دی گئیں اور ان پر ہر وہ شخص چڑھا دیا گیا جو طغرل کا کبھی بھی طرفدار ۔۔۔ ایک مست قلندر تھے جنہوں نے طغرل کو دعا دی تھی انہیں بھی سولی چڑھا دیا گیا۔ سولیاں بڑے بڑے لکڑی کے ستون تھے جن پر بھالے کی طرح چوڑی ہوتی تھی۔ ملزم کو اس پر بٹھا دیا جاتا۔ سولی اس کے جسم میں۔۔۔۔ گھستی جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم دو ٹکڑے ہو کر زمین پر گر جاتا۔ دو ہزار سولیوں پر برابر لوگ چڑھائے جاتے اور سلطان دیکھتا رہا۔ ابن مسلم کا وحشت سے برا حال ہو گیا مگر سلطان کی موجودگی میں دم مارنے کی گنجائش نہ تھی۔ یہ ہیبت ناک سماں ختم ہوا تو سلطان نے اپنے بیٹے بغرا خاں کو بنگال کا صوبہ دار مقرر کیا۔ وہ بھی بہت دہشت زدہ تھا۔ اس سے سلطان نے کہا "تم نے میرا انصاف دیکھا ہر باغی کی یہی سزا ہوگی۔" پھر اس نے صوبہ داروں کی طرف مڑ کر کہا: "عیش پسند ہوتے جا رہے ہو عیش پسندی کی سزا بھی یہی ہوگی۔" تمام صوبہ دار یہ سن کر کانپ گئے۔

ابن مسلم گھر واپس آ گیا۔ کئی دن تک نہایت درجہ ہیبت زدہ رہا۔ پاروتی سے وہ وہاں کا حال بیان کرتا اور کانپ جاتا۔

"اُف۔ ظالم۔" پاروتی کہتی۔ "یہ ترک کتنے ظالم ہیں۔"

"اب میں سپاہی نہیں رہا۔"

"کیوں تمہارے ہی تیر سے تو طغرل گرا۔"

"ہاں تیر سے۔ ہم لوگ تیر فگن نہیں تیغ زن تھے تم نے مجھے تیر انداز بنا دیا۔ تیر چلاتا ہے میں اگر اتنا بزدل نہ ہو گیا ہوتا تو ہرگز تیر سے کام نہ لیتا۔ بڑھ کر طغرل سے مبارز طلب"

"خیر اب سب بھول جاؤ۔ اطمینان سے گھر آ گئے۔"

"نہیں آما میں ۔ اور بزدل ہوتا جا رہا ہوں۔ یہ ناچ بند کرو۔ میں خود سپاہیوں کی دیکھ بھال کیا کروں گا جیسے سپاہی پہلے ہوتا ہے۔"

آما اس کی سنجیدگی پر ہنسی، وہ بھی مسکرا کر اس سے چمٹ گیا۔

اب دلی کے حالات کی طرف اس کی توجہ پھر آگئی۔ منگول کے ہاتھ سے بلبن کے فرزند رشید شہزادے محمد کے قتل کی خبر آئی۔ امیر خسرو کا ترجیع بند مرثیہ اس کے دربار کے شاعر نے اُسے سنایا۔ اسے یہ بند بہت پسند آیا۔

ہر دمے بر رفتے آں فرخ لقا بگریستند
روز و شب ہمہ سالِ آں اندک بقا بگریستند
خلق ملتان از زن و مرد مویہ کناں و موکناں
کوبکو و موبمو و جابجا بگریستند
از خروش گریہ و بانگ اہل شب کس نخفت
ایں کہ در ہر خانۂ اہل عزا بگریستند

سلطان نے بنگال سے بغرا خاں کو اپنے پاس بلوایا مگر وہ ...... دربار کی شدت پسند فضا برداشت کرسکا۔ سلطان نڈھال ہوتے ہوتے ایک دن ختم ہو گیا۔ امرا نے بغرا خاں کے اٹھارہ برس کے عیاش لڑکے کیقباد کو سلطان منتخب کر لیا۔

کچھ ہی عرصے کے بعد دلی سے آئے ہوئے کچھ صوفیہ نے دربار میں ابن مسلم کو کیقباد کے قتل کا حال سنایا۔ "وہ نہایت درجہ عیاش تھا۔ ہر وقت شراب پیئے رنڈیوں کے ساتھ ناچا کرتا تھا۔ انتظام وادبک کے ہاتھ میں تھا جو خود قوت حاصل کرنے کے لئے کیقباد کو عیاشی ہی میں منہمک رکھنا چاہتا تھا۔"

"اور بغرا خاں کا کوئی پتہ نہ لگا؟"

"باپ بیٹوں کی جنگ اور پھر صلح کا حال تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ ہمارے امیر خسرو نے اس پر ایک مثنوی "قران السعدین" لکھی ہے۔"

"مگر اس کے بعد بغرا خاں کہاں گئے؟"

"غائب ہو گئے۔"

"اچھا کیقباد کے مارے جانے کا حال بتاؤ۔"

"کچھ کہتے ہیں کہ ایک لڑکی نے لاتیں مار کر جمنا میں گرا دیا۔ مگر اصل واقعہ یہ ہوا کہ جلال الدین خلجی ترک امیروں کا خاتمہ کر کے محل میں داخل ہوا تو جمنا کے کنارے کے دالان میں کیقبا

[illegible] کا ارادہ تھا اس کو کپڑے میں لپیٹ کر جمنا میں پھینک دیا گیا۔"

"ڈوب گیا جمنا میں۔ زندگی نے دھکیل دیا یا پاپی نے بہا دیا۔"

"جلال الدین شاہ خلجی بڑے نیک اور غفار ہیں۔ ان کے سامنے ڈاکو پیش ہوئے انھوں نے نصیحت فرمائی اور معاف کر دیا۔"

پھر ابن مسلم کے پاس ایک فرمان آیا کہ جلال الدین خلجی کا داماد علاؤالدین کڑہ کا حاکم مقرر ہوا اور ابن مسلم اس کے زیر تابع رہے گا۔ ابن مسلم کڑہ میں علاؤالدین کے دربار میں حاضر ہوا۔ علاؤالدین نے دکن پر فوج کشی کرنے کے ارادہ کا اظہار کیا اور فوج تیار رکھنے کی تاکید کی۔

ابن مسلم اب پھر ویسا ہی مستعد سپاہی ہو گیا تھا جیسا کہ پہلے تھا۔

علاؤالدین اپنے چچا اور خسر سلطان جلال الدین خلجی سے چندیری فتح [illegible] اجازت حاصل کر کے تھوڑی فوج کے ساتھ دکن کی طرف چلا۔ ابن مسلم جو اس نے اپنا خاص [illegible] تھا۔ اور اسی کو معلوم تھا کہ علاؤالدین اصل میں دیوگری کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ مہم بڑی مشکل کا تھا۔ بڑے گھنے جنگل بڑے بڑے پہاڑ اور چوڑے چوڑے تیزی سے بہتے ہوئے دریا۔ مگر علاؤالدین کا عزم ان سب کو پار کراتا ہوا دو ماہ میں اسے ایلچپور لے آیا۔ آٹھ ہزار چیدہ سپاہیوں کی فوج اس کے ساتھ تھی۔ ہر سپاہی جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھا۔ ہر سپاہی رازدار تھا اور اگر کوئی راہ گیر فوج کی بابت کچھ پوچھتا تو اُسے بتایا جاتا کہ دلی کا ایک امیر راج مندری کے راجہ کے [illegible] جا رہا ہے۔ لشکر اجنتا کی پہاڑیوں میں راہ بناتا ہوا گھٹی لاجورا کے میدان میں داخل ہو گیا۔ ابن مسلم نے ایک تیر کمان میں جوڑ کر بستی کی طرف چلایا۔ زمین پر گر کر تیر آدھے سے زیادہ زمین میں گڑ گیا۔ ایک کسان نے بمشکل اس تیر کو زمین سے نکالا اور لاجورا کے کانہا کے پاس لے گیا۔ کانہا فوراً ہی تیر لے کر راجا رام دیو کے پاس دیوگری دوڑ گیا۔ تیر کو راجہ کے سامنے ڈال کر [illegible] کی فوج ادھر آ پہنچی اب خیر نہیں۔"

تیر بہت زیادہ لمبا اور وزنی تھا۔ راجہ رام دیو اسے دیکھ کر تعجب کرتا رہا۔ [illegible]

فوج اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ تیرتھ پر گئی ہوئی تھی۔ مگر اس نے کانہا کو مسلم فوج کے روکنے کا حکم دیا۔ کانہا فوراً میدان میں آ گیا۔ اسے جلد شکست دے کر علاؤ الدین کی فوج تیزی کے ساتھ دیوگری کے قلعہ کی طرف بڑھی اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ کو قلعہ کے اندر رسد نہ پہنچ سکی اس لئے اس نے امان طلب کی اور کثیر دولت اور اپنی ایک بیٹی تحفہ میں لے کر علاؤ الدین کے سامنے آیا۔

اس وقت راجہ کا بیٹا فوج کے ساتھ تیرتھ سے واپس ہوا اور مسلمانوں سے جنگ کرنے لگا۔ ابن مسلم اس فوج میں تھا جو قلعہ کی حفاظت کے لئے تھی۔ اس نے فصیل پر سے دیکھا کہ اسلامی فوج دکنیوں کی کثیر فوج میں گھر گئی۔ اس نے ملک نصرت کو خبر دی جو اپنی فوج کو چکر دے کر دکنیوں پر جا ٹوٹا۔ دکنی بھاگ نکلے۔ اب علاؤ الدین نے صلح کے اور بھی سخت مطالبات پیش کئے۔ منوں سونا چاندی اور جواہرات لے کر سات ہاتھیوں اور ہزاروں بڑے بڑے اونٹوں پر لادا گیا اور فوج کڑے واپس ہوئی۔

ابن مسلم نے کڑے سے اپنے گھر واپس جانے کی اجازت مانگنا چاہا مگر علاؤ الدین نے اسے نہ جانے دیا۔ بلکہ عفو تقصیر کا ایک خط دے کر اسے دلی بھیجا۔ سلطان نے اس سے دیوگری کی فتح کے بابت بات چیت کی اور یہ جان کر کہ بے انتہا دولت ہاتھ لگی ہے اس نے علاؤ الدین کو مع تمام مال کے خود طلب کیا۔ جب علاؤ الدین کو یہ خط ملا تو اس نے خط میں یہ لکھوایا کہ سلطان خود کڑے تشریف لائیں اور تمام مال غنیمت کی نذر قبول فرمائیں۔ جلال الدین پر یہ خط پڑھتے ہی لالچ سوار ہوئی۔ وہ فوراً روانہ ہو گیا۔ گنگا کے اس پار سے کشتی میں سوار ہو کر کڑے کی طرف چلا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ روزے سے تھا۔ بھری برسات تھی اور گنگا میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ ابن مسلم اور چند امیر کشتی میں ساتھ تھے۔

دوسرے کنارے پر علاؤ الدین استقبال کے لئے تیار کھڑا تھا۔ عصر کی نماز سلطان نے کشتی پر ادا کی۔ اس کے بعد کشتی کنارے لگائی گئی۔ جلال الدین اترا اور علاؤ الدین دوڑ کر اس کے پیروں پہ گر گیا۔ جلال الدین نے جھک کر اٹھایا ہی تھا کہ اس کے سر پر ایک تلوار لگی۔ وہ چونک کر بولا: "اسے علاؤ بدبخت۔ یہ کیا کر دیا؟" اور کشتی کی طرف بھاگا۔ علاؤ الدین نے لپک کر اپنی تلوار سے اس کی گردن اڑا دی اور اس کے سر کو نیزے پر نصب کرا کے فوج کو دکھانے کے لئے بلند کر دیا۔

ابن مسلم دنگ ہو کر یہ سب دیکھتا رہا۔ نیک، نمازی، روزہ دار جلال الدین کے اس طرح خاتمہ نے اسے ظلم کی انتہا دکھا دی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ علاؤ الدین سے علالت کا بہانہ کر کے واپسی کی اجازت طلب کی۔ علاؤ الدین کو اب جلد دلی پہنچ کر تخت سلطنت پر قبضہ کرنے کی پڑی ہوئی تھی۔ کرکٹ شاہ کڑے کے صوفی قطب نے آگے امید لائی اور فرمایا ؎

"ہر کہ در آرد با تو جنگ
تن در کشتی سر در گنگ"

ابن مسلم کو محسوس ہوا کہ صوفیا کا بھی اب سیاست میں دخل ہو گیا ہے۔ کرکٹ شاہ نے اسے گھر لوٹنے کی اجازت دلوا دی۔ علاؤ الدین دلی کی طرف خزانہ لٹاتا ہوا بڑھا۔ امیر خسرو کے یہ اشعار ابن مسلم تک پہنچے۔

خزانہ زیر شد منزل بہ منزل ۔۔۔ بہ زر کردہ کلید کار مشکل
چو بادلی فتادا از فتح کارش ۔۔۔ گرفت از منجنیق از حصارش

علاؤ الدین کی تاجپوشی کے سلسلے میں ابن مسلم کو بھی طلب کیا گیا۔ مگر اس نے علالت کی بنا پر معذرت چاہی۔ پاربتی کو علاؤ الدین کا مکر اور ظلم ذرا بھی پسند نہ آیا۔ ابن مسلم بھی اس کا ہم رائے ہوا۔ علاؤ الدین کے فوجی کارناموں سے وہ دور ہی رہا مگر جب علاؤ الدین نے سرکاری سپاہ الگ بنائی تو ابن مسلم کو بھی سردار کا عہدہ دیا۔ اب اسے پاربتی کو ساتھ لے کر دلی میں آنا اور وہیں رہ جانا پڑا۔ علاؤ الدین کی فتوحات میں اس نے حتی الوسع حصہ نہ لیا۔ علاؤ الدین کے مظالم سے وہ کانپتا رہا۔ علاؤ الدین کو اب حسین عورتوں کا بڑا شوق ہو گیا تھا۔ اور ابن مسلم خوف کھاتا رہا کہ اگر کہیں اس نے پاربتی کو دیکھ پایا تو کیسی بنے گی۔

علاؤ الدین نے چتوڑ کی رانی پدمنی کے حسن کی شہرت سنی۔ پدمنی شادی شدہ تھی اور بچی کی ماں تھی۔ مگر اس کی نزاکت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس کا رنگ ایسا گورا تھا کہ پان حلق

تو پیک کی سرخی گردن میں جھلکتی تھی۔ آنکھیں آم کی پھانکیں تھیں۔ کمر چیتے کی سی تھی چال دیکھنے والوں کو مست کر دیتی تھی۔ علاؤالدین کے دل میں گدگدی ہوئی۔ اس نے چتوڑ کے راجہ کو خط بھجوایا کہ پدمنی کو اس کے حوالے کر دے۔ راجپوت راجہ نے خط پڑھتے ہی طیش میں آ کر نامہ بر کو قتل کر دیا۔ خبر آئی پہنچی علاؤالدین نے فوراً فوج کشی کا حکم دے دیا۔ اب شاہی فوج ایک شہر کا شہر ہونے لگی تھی۔ ہر قسم کے دکاندار اس کے ساتھ چلتے۔ ہر سردار اپنی بیویوں کو پالکیوں میں ساتھ لے جاتا۔ ہر پڑاؤ پر محفل رقص و سرود ہوتی۔ ہر جمعرات کو قوالی ہوتی۔ یہ فوج ریگستان میں منگل مناتی ہوئی چتوڑ پہنچ گئی۔

چتوڑ کا راجہ سب راجپوتوں کا سردار تھا۔ اس کی ناموس کا معاملہ تھا۔ اس لئے تمام راجپوت اسی دن سے جمع ہونے لگے تھے جب سے اس نے علاؤالدین کے نامہ بر کو مارا تھا۔ چتوڑ کا قلعہ بھی ایسا مضبوط تھا کہ اس کو توڑنا ناممکن تھا۔ علاؤالدین کے مقابلے کے لئے کثیر فوج موجود تھی جس نے اس کے کئی حملوں کو ہٹا دیا۔ ابن مسلم نے ایک مشورہ دیا کہ پہلے علاؤالدین پدمنی کو دیکھ تو لے۔ علاؤالدین اب ویسا صاحب عزم اور خونخوار سپاہی نہیں رہ گیا تھا جیسا کہ وہ دیوگر کو فتح کرتے وقت تھا۔ اب تک وہ سنے سنائے حسن پر ہی عاشق ہوا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ اتنے کشت و خون سے پہلے اگر وہ پدمنی کو دیکھ لے تو اچھا ہی ہوگا۔ وقتی صلح کا اعلان ہوا۔ ابن مسلم بات کے لئے بھیجا گیا۔ آقا کو چتوڑ کے قلعے میں آنے کی راجہ نے فوراً اجازت دے دی۔

ایک روز علاؤالدین راجپوتوں کے خیمے کے پاس آ کر بیٹھا۔ اس کے سامنے داہنی طرف ایک قد آدم آئینہ لگایا گیا جس میں ایک خیمے کا در دکھائی دے رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس میں ایک حسین عورت دکھائی دی جس کے حسن کی کوئی انتہا نہ تھی۔ علاؤالدین دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ایسا حسن اس نے کبھی پہلے نہ دیکھا تھا۔ بیتاب ہو کر خیمہ کی طرف دیکھنے لگا۔ پدمنی اندر چلی گئی۔ وہ تلوار کھینچ کر خیمہ کی طرف بڑھا اور خیمے میں گھس گیا۔ خیمہ خالی تھا۔ اس نے باہر آ کر اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔ سب مسلمان فوج دوڑتی ہوئی آ پہنچی اور راجپوتوں کے خیموں کو گھیر لیا۔ سلطان ایک ایک خیمہ میں گیا مگر سب خالی تھے۔ معلوم ہوا پدمنی اور اس کے ساتھ کی عورتیں خیموں

میں ہوتی ہوئی قلعہ میں چلی گئیں۔

فوراً قلعہ پر حملہ بول دیا گیا۔ ہاتھیوں کی زبردست ٹکر سے قلعہ کا پھاٹک توڑ ڈالا گیا۔ مسلمان اندر گھس گئے۔ علاؤالدین خود ان کے درمیان تھا۔ گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔ راجپوت سردار بڑی دلیری سے لڑے مگر قتل ہوتے گئے۔ قلعہ فتح ہو گیا۔

مگر جب علاؤالدین قلعہ کے زنانے حصے میں داخل ہونے والا تھا تو اس میں سے پہلے دھواں بلند ہوا اور پھر آگ کا شعلہ اٹھا۔ شعلہ اتنا بڑا ہو گیا کہ پورا محل ایک شعلہ معلوم ہوا۔ شعلہ کی گرمی اس قدر شدید تھی کہ مسلمان فوج کو بہت کافی پیچھے ہٹنا پڑا۔

"پدمنی نے جوہر کر لیا۔"

علاؤالدین نے اپنی تلوار زمین پر پٹخ کر کہا۔ "اس راجپوتنی حسینہ نے مجھے ہرا دیا اسی نے مجھے ہرا دیا۔ میں اسی سے ہارا۔"

فوج کو واپسی کا حکم دے دیا گیا۔

ابن مسلم کو پاروتی کی فکر تھی۔ پاروتی قلعہ ہی میں تھی۔ وہ بھی جوہر میں شریک ہو گئی ہوگی۔ وہ بھی جل کر مر گئی۔ مگر وہ مر نہیں سکتی۔ تو پھر کہاں گئی؟ وہ فوج سے الگ ہو کر ریگستان میں دیوانہ وار روانہ ہو گیا۔

حصّہ دوم

بہر سُو رقصِ بسمل ....

(حضرت نظام الدین اولیاؒ کی غیاث الدین تغلق شاہ پر کرامت سے جلال الدین اکبر شاہ کی تخت نشینی پر آمد تک)

۱

شاہ نظام الدین اولیاء کا دربار جما ہوا تھا۔ حضرت دیوار سے لگے ہوئے ایک قالین پر جلوہ افروز تھے۔ پیچھے گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ قالین کے کونے پر حضرت امیر خسرو دوزانو بیٹھے تھے دو رویہ قالینوں کی قطار محراب تک چلی گئی تھی۔ ان پر مریدانِ خاص دوزانو بیٹھے تھے۔ خلق خدا آکر اپنی حاجت بیان کرتی۔ کوئی شاہ اعلیٰ مقام کے ہاتھ چومتا کوئی پیروں پر گر جاتا۔ اپنے دلی مقاصد بیان کرتا حکم شاہ آدابِ لٹے پیروں لوٹ جاتا۔

ایک شخص آکر دست بستہ سامنے کھڑا ہوا اور بولا "حضور غیاث الدین تغلق شاہ نے بنگال میں امراء سے کہا کہ دلی پہنچتے ہی ہم سب کو برباد کر دیں گے۔"

شاہ صاحب نے اطمینان سے مسکرا کر فرمایا۔ "ہنوز دلی دور است۔"

پھر ایک آدمی اسی طرح کھڑا ہوا اور بولا "حضور وہ بہار پہنچ گئے۔"

حضور نے پھر اسی اطمینان سے فرمایا "ہنوز دلی دور است۔"

"حضور وہ بنارس پہنچ گئے۔"

"ہنوز دلی دور است۔"

"حضور وہ پریاگ پہنچ گئے۔"

"ہنوز دلی دور است۔"

"حضور وہ اودھ پار کر گئے۔"

"ہنوز دلی دور است۔"

"حضور وہ کل تغلق آباد پہنچ جائیں گے۔"

"ہنوز دلی دور است۔"

"حضور شہزادے جونا خان ان کے استقبال کے لئے جا رہے ہیں۔"

"مسلم!"

مریدوں کی قطار میں سے مستقیم چونک کر اٹھا اور شاہ صاحب کے سامنے آکر دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ حضور نے ایک مہر لگا ہوا خط اپنے تکیہ کے نیچے سے اٹھایا۔ اسے مستقیم کو دیا اور فرمایا "ابھی جاؤ اور تم ان کے ہمرکاب رہنا۔" مسلم الٹے پاؤں دربار سے باہر نکل آیا۔

پھر ایک شخص نے عرض کی۔ "سلطان تغلق آباد پہنچ گیا۔"

"ہنوز دلی دور است۔" پھر حضور نے فرمایا۔)

تغلق آباد میں مستقیم جب شہزادے جونا خاں اور دوسرے امراء کے ساتھ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک عارضی کوشک بنی تیار ہے۔ سلامی اور دوسری رسموں کے بعد کھانا کھانے کے لئے بادشاہ کو اس میں بٹھایا گیا۔ کھانا نہایت درجہ پرتکلف تھا۔ اس کے بعد بہت سے لوگ کوشک سے باہر نکل آئے مگر بادشاہ اور اس کے خاص امراء بیٹھے رہے۔ کوشک کے قریب سے ہاتھی دوڑتے ہوئے نکلے عمارت ہلنے لگی۔ بادشاہ کے قریب کے امراء میں سے کچھ اور شہزادہ جونا خاں باہر نکل آئے۔ عمارت گر گئی اور بادشاہ مع کئی ساتھیوں کے دب کر مر گیا۔ اس کی نعش کو ڈھیر میں سے نکالا گیا اور قریب ہی ایک مقام پر دفن کر دیا گیا۔

مستقیم نے سارا واقعہ درگاہ میں آکر بیان کیا۔ تمام مریدوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ شہر کی گلی گلی میں اس کرامت کی خبر پھیل گئی۔ جونا خاں محمد تغلق کے لقب سے سلطان ہوا۔ وہ

شاہ نظام الدین کی پابوسی کیلئے آیا۔ ابن مسلم کو محسوس ہوا کہ اب سلاطین سے زیادہ اہم صوفیہ تھے۔ محمد تغلق شاہ کو طاقت سلطان تھا شاہ نظام الدین اولیاء کی طاقت سے کہیں زیادہ تھی۔

اسی رات قوالی کی خاص محفل ہوئی۔ امیر خسرو نے ایک لاجواب غزل کہی جو گائی گئی قوالوں نے ستار پر تال اٹھائی تالیاں بجائیں ایک نے مصرعہ پڑھا۔

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

تمام محفل متوجہ ہو گئی۔ کئی بار نے بدل بدل کر یہ مصرع گایا گیا پھر ایک دم سے دوسرا مصرعہ پڑھایا گیا۔

بہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم

شاہ صاحب نے زور سے آہ بھری اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ تمام محفل اٹھ کھڑی ہوئی۔ قوال بھی کھڑے ہو گئے اور پورے شعر کو تکرار سے پڑھنے لگے۔ ایک مرید ناچنے لگا۔ سب ناچنے لگے۔ شاہ صاحب پر وجد کا عالم تھا۔ انہوں نے امیر خسرو کا منہ چوم لیا اور شعر کو دہرانے لگے۔

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من دانم

بہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم

مسلم ایک دیوار سے لگا سارا سماں دیکھ رہا تھا۔ حقیقت میں ہر سو رقص بسمل تھا نہ معلوم کتنی دیر تک قوال شعر دہراتے رہے اور یہ سب بسمل ناچتے رہے۔

ابن مستقیم اپنے خوابوں میں گم ہو گیا۔ پاروتی کو اس نے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تھا۔ راجپوتانہ کی پہاڑیوں کی کوہوں میں ہوتا ہوا وہ سندھ کے ریگستان میں نکلا تھا۔ خواب میں اس نے دیکھا کہ پاروتی سنگم پر کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے "میں جلی نہیں۔ آؤ میرے پاس آؤ میں بیقرار ہوں۔" وہ پھر اٹھ کر چل دیا تھا اور سندھ دریا کے کنارے پہنچا تھا۔ پھر پنجاب میں داخل ہو گیا تھا جسم پر لیتھڑے لٹک گئے تھے پیر سوج گئے تھے۔ لاہور پہنچا تھا۔ داتا گنج بخش کے مزار میں داخل ہوا تھا۔ وہاں کیا ہوتا تھا۔ قوالی نہیں ہوتی تھی۔ اس کا دھیان پھر ناچتے ہوئے مریدوں کی طرف

آگیا۔ شاہ صاحب بیٹھ گئے۔ سب مرید بھی بیٹھ گئے۔ قوالوں نے دوسرا شعر اٹھایا ؎

رقیباں گوش بر آواز و او در ناز و من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائے کہ من بودم

مسلم کو محسوس ہوا کہ یہ شعر اس کے لئے کہا گیا تھا۔ پاروتی ناز میں غائب تھی وہ ترساں تھا۔ یہ محسوس کرتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ناچنے لگا۔ وہ ناچ میں کہتا "رقیباں گوش بر آواز۔ رقیباں گوش بر آواز" پھر کئی چکر کھا کر کہنے لگتا "او در ناز و من ترساں" یہ کہتا ہوا وہ شاہ صاحب کے پاس آیا اور قدموں پر گر پڑا۔ شاہ صاحب نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ وہ بیٹھ گیا اور روتا رہا۔ قوال شعر کی تکرار کرتے رہے۔ غزل کے اور شعر پڑھتے رہے۔ تعریفیں ہوتی رہیں۔ آخر کو قوال مقطع پر آگئے ؎

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمد شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

شاہ صاحب اٹھ کر امیر خسرو سے چمٹ گئے فرمایا "کمال کر دیا۔ اگر میری بخشش ہوگی تو اس ترک کی کج کلاہی کی بنا پر...... واہ پہلے مصرعے نے معاملہ ہی ختم کر دیا تھا مگر واہ کیا دوسرا مصرعہ آیا ہے۔ الہام ہے الہام۔

"محمد شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم"

اور پھر حال میں آگئے۔ امیر خسرو خود ناچنے لگے۔ سب اٹھ کر ناچنے لگے۔ ناچتے رہے۔ مسلم بھی ناچ میں شامل تھا۔ ناچتے ناچتے گر پڑا۔

اس رات کے بعد وہ عجیب عالم میں رہتا۔ کس منزل سے وہ گزر رہا تھا کس منزل میں وہ تھا۔ بہر سو رقص بسمل بود۔ وہ بھی بسمل تھا۔ تمام دنیا بسمل تھی۔ سپاہی کی زندگی ختم ہو چکی تھی۔ اللہ اکبر کہہ کر کفار پر ٹوٹ پڑنے کا زمانہ بہت دور معلوم ہو رہا تھا۔ وہی جوش اب محفل سماع میں ناچ ناچ کر ختم ہو رہا تھا۔ وہ کیا کر سکتا تھا؟ او در ناز و من ترساں۔ پدمنی کے ناز نے سپاہی کو بھی

کر دیا تھا۔ پدمنی کا جوہر اس کی فتح تھی۔ علاؤ الدین نے ہار مان لی تھی۔ مالا پاروتی کے ناز نے اسے بھی ترساں بنا دیا تھا۔ وہ غزنی میں بھی ترساں تھا مگر امید کے ساتھ۔ پھر اس کے آنے کی امید تھی اور پوری ہونی موہوم تھا۔ تلوار تھی۔ گھوڑا تھا موقع آ ہی گیا۔ اب کچھ نہ تھا۔ تلوار بے زنگ گھوڑا غائب۔ پاروتی کہاں تھی معلوم نہیں۔ سنگم پر اس کا مندر بھی غائب ہو چکا تھا۔ وہ اسے ڈھونڈتا ہوا ادھر آیا تھا۔ کیا دیکھا تھا؟ سلطان محمد تغلق شاہ کو اپنے باپ غیاث الدین تغلق شاہ پر کوشک گرواتے ہوئے۔ کوشک کمزور بنائی گئی تھی۔ ہاتھی پاس سے دوڑائے گئے تھے کس کے حکم سے؟ "ہنوز دلی دور است" کا اطمینان شاہ صاحب کا اپنی طاقت پر بھروسہ دکھاتا تھا۔ اب ان کی ہی حکومت ہے۔ وہ ان کا مرید ہے مگر وہ ان کے دربار سے نکل جانا چاہتا ہے۔ کہاں؟ کہاں؟

محمد تغلق شاہ تخت نشین تھا۔ مگر وہ پاگل تھا۔ باپ کو مار کر اس کا دماغ ٹھیک نہیں رہا تھا۔ بات بات پر قتل کرتا تھا۔ سروں کے ڈھیر لگاتا تھا۔ مسلم کو اس کی خدمت میں حاضری دینا ضروری تھی۔ ایک دن ایک ملازم کو آفتابہ اٹھانے کا حکم دیا۔ وہ لانے میں گھبرایا۔ سلطان نے اس کا سر اڑا دیا۔ مسلم ششدر دیکھتا رہا۔ سلطان نے اس کی طرف دیکھا اور اسے ایک لاکھ تنکہ دینے کا حکم دیا۔ وہ اتنا مال لئے ہوئے اپنے حجرے میں گیا۔ وہ یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس رقم کا کیا کرے۔ اس نے نظام الدین اولیاء سے عرض کی۔ انہوں نے نصف خانقاہ کے لئے لے لیا اور نصف اس کو دے دیا۔ اس رقم کو لے کر وہ سنگم واپس آنا چاہتا تھا۔ شاید وہیں اس کی للا اس کو ملے۔ شاید وہ وہاں پہنچ گئی ہو۔ وہ آسکے گی ضرور۔ وہ جلی نہیں تھی۔ وہ ہرگز نہیں جل سکتی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کی مسکراہٹ! نہیں وہ ضرور آئے گی۔

مگر وہ سلطان اور شاہ سے اس طرح وابستہ ہو گیا تھا کہ ان کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ شاہ کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی تھی اور کچھ ہی عرصے کے بعد ایک روز ان کا وصال ہو گیا۔ سلطان پر بڑا اثر ہوا مگر سلطان سے زیادہ امیر خسرو پر اثر ہوا۔ وہ بالکل پاگلوں کی طرح پھرنے

Scanned with CamScanner

لگے ایک دن پیر کی قبر پر آ کر اتنی رقت طاری ہوئی کہ وصال ہو گیا۔ سلطان طور بھی زیادہ پاگل ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ دلی سے دارالسلطنت دیوگری بدل دیا جائے۔

مسلم آب اپنے تئیں بہت ہی اکیلا محسوس کرنے لگا تھا۔ تین ماہ کے اندر ہی دنیا کا تلپٹ ہو جاتا ایک ایسی عجیب حالت تھی جس نے اس کا بھی سر چکرا دیا تھا۔ اسے امیر خسرو سے خاص طور پر محبت ہو گئی تھی۔ امیر کی والدہ اس کی آنا کی بہنوں میں سے تھی اور امیر پہلے معروف مسلمان تھے جنھوں نے ہندوستان کے گن گائے۔ اس نے امیر خسرو کا سارا کلام نقل کر کے اپنے پاس رکھا تھا اور خالی وقت میں اسے پڑھا کرتا تھا۔ آنا کی یاد کو امیر خسرو کے ان اشعار سے تسکین ہوتی جن میں ہندوستان کا ذکر آتا۔ خاص طور پر وہ یہ شعر دوہراتا۔

زہے تراشش آں نازنیں بہ عیاری
کبوترے بہ نشاط آمدہ است پنداری

مثنوی "دیول رانی اور خضر خان" کو وہ بہت زیادہ پڑھتا۔ اس میں ہندوستانی رنگ پورے عروج میں آ جاتا اور اس ٹکڑے کو تو اس نے زبانی یاد کر لیا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے آنا پاروتی کی تصویر پھرتی اور وہ عجیب عالم میں پہنچ جاتا۔

بتان ہند را نسبت ہمیں است	بہر یک موئے شان صد ملک چین است
چہ گیری نام از یغما و خلخ	کہ غالب تیر چشم اند و ترش رخ
ہمہ یاد آری سپید و سرخ روئے	چو گلہائے خراسان رنگ و بے بوئے
دگر بینی جز از روم و از روس	از ایشاں نیز آید لابہ و بوس
سپید و سرد ہمچوں کشتہ یخ	کز ایشاں رم خورد کانون دوزخ
خطائے تنگ چشم و پست بینی	مغل را چشم و بینی خود نہ بینی
لب تا تار خود خنداں نباشد	ختن را خود نمک چنداں نباشد
سمرقندی و آنچہ از قندھار ند	بجز نامے ز شیرینی ندارند

برھر و درم ہم ہمیں خداشند
ولیکن چستی و چالاکی ندانند۔

اسے محسوس ہوتا کہ امیر نے یہ اشعار آنا کو دیکھ کر لکھے تھے۔ مثنوی نہ سپہر کے چار سو ابیات جو ہندوستان کے رہنے والوں کی تعریف میں ہیں اسے بہت بھاتے۔ ہندوستان کی شو دیکھ کر اسے یہ شعر یاد آتا۔

ثبات ملک ہند کہ حجت بہ جنت است
حجت ہمہ بہ قاعدہ ملک استوار

جب ہوا چلتی تو یہ شعر یاد آتا۔

ترجیح ملک ہند بعقل از ہوائے خوش
بر روم و بر عراق و خراسان برف بار

ہندوستان کے لوگوں سے مل کر وہ اکثر یہ شعر پڑھتا۔

ترجیح اہل ہند بر اہل عجم ہمہ
در زیرکی و دانش و دلہائے ہوشیار

اُسے ہندوستان کی زبان سے بھی محبت ہو گئی تھی اور اس محبت کا اظہار وہ امیر کے اس شعر سے کرتا۔

اثبات گفت ہند بحجت کہ راجح است
بر پارسی و ترکی از الفاظ خوشگوار

وہ خسرو کے کلام سے گہرا عشق رکھتا تھا اور خسرو کا یہ فخریہ شعر اس سلسلے میں اس کا ایمان تھا۔

حجت در آں کہ چون خسرو بہ سخن ۔۔۔ سحر گرے نیست بہ چرخ کہن

مثنوی "خضر خان اور دیول دیوی" اسے بہت ہی زیادہ مرغوب تھی اس کا وہ حصہ

جس میں ہندوستان کی تاریخ بیان ہوئی ہے اس کے لئے بڑا بصیرت افروز تھا۔ اس کے شروع کے اشعار جو ہندوستان میں مذہب اسلام پر تبصرہ تھے اسے زبانی یاد تھے۔ خسرو کے ساتھ وہ کافی رہا تھا اور ان کے اخلاق کو بھی یاد کیا کرتا تھا۔

مگر اس کا خاص کام سلطان اور شاہ کے درمیان رابطہ قائم رکھنا تھا۔ سلطان محمد تغلق نے اسے اکثر بلاتا اور باتیں کرتا۔ ادھر شاہ نظام الدین اولیاء دلی میں اپنا خلیفہ شاہ نصیر الدین چراغ کو مقرر کر گئے تھے ان کا اور اس کا ہر وقت کا ساتھ ہی تھا اور سلطان کے یہاں سے واپس آ کر وہ ان سے بھی اہم بات چیت میں مشغول ہو جاتا۔

ایک دن محمد تغلق نے اسے اپنی آرام گاہ میں طلب کیا۔ سلطان پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ پاؤں زمین پر تھے۔ فکر میں غرق تھا۔ مبہوتوں کی سی شکل تھی۔ مستقیم روبرو کھڑا ہو گیا۔

"مجھے بڑی فکر ہے کہ ان صوفیہ کا کیا کروں۔"

"جو حکم ہو۔"

"حکم؟ میرا حکم؟ اصل میں تو سلاطین پر صوفیہ حاوی ہو رہے ہیں۔"

مستقیم خاموش رہا۔

"سلطان المشائخ محبوب الٰہی نے علاؤ الدین خلجی ایسے جلیل القدر بادشاہ کو ٹھوکر پر مارا۔"

"مجھے علم نہیں میں اس زمانے میں سر بصحرا تھا۔"

"سلطان علاؤ الدین نے ایک دفعہ ان سے ملنے کو کہا تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ میرے گھر کے دو دروازے ہیں اگر بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہوگا تو میں دوسرے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا...... میرے باپ نے ٹھیک دیکھ لیا تھا کہ ان کا زور کم کرنا ضروری تھا...... مگر اُف جانے دو۔"

مستقیم ششدر کھڑا رہا۔

خیر میں نے غلطی کی۔ اب میں ان کا زور کم کر دوں گا۔ یہ لوگ نئے رنگ میں مست کر کے رعایا کو مجھ سے پھراتے ہیں۔"

سلطان اٹھ کھڑا ہوا اور زمین پر ٹہلنے لگا۔ ایکدم سے بولا "چراغ سے کہو کہ وہ میرے خدمت گار ہوں گے۔ میرے کپڑے بدلانے کی خدمت اُن کے سپرد ہوگی اور دوسرے صوفیہ سے بھی ایسے ہی کام لئے جائیں گے۔"

مستقیم چلا آیا اور شاہ چراغ کے پاس با ادب بیٹھ کر سلطان کا حکم سنایا۔ شاہ نے فرمایا "اس پاگل کو کیا ہو گیا ہے۔ کہو ہم اس کے حکم سے انکار کرتے ہیں۔" مستقیم نے یہ بات سلطان سے آ کر کہی۔ سلطان نے فوراً شاہ چراغ کی گرفتاری کا حکم دیا۔ سپاہی ان کو پکڑ لائے اور قید میں ڈال دیا۔

قید میں مستقیم ان سے ملا۔ کچھ دیر باتوں کے بعد شیخ نے فرمایا "مرتے وقت میرے مرشد نے ہدایت کی تھی کہ تمھیں دلی میں رہ کر خلق کے ظلم و ستم برداشت کرنا چاہیے۔ تو مجھے اب سلطان کا ناگوار حکم مان لینا چاہیے۔"

مستقیم نے سلطان کو اس بات سے مطلع کیا۔ سلطان نے فوراً رہائی کا حکم دیا۔ شیخ شاہی قلعہ میں رہے اور ان کے ساتھ بہت سے صوفیہ بھی مختلف قسم کی خدمات میں مصروف نظر آئے۔ سلطان نے اس طرح زیادہ تر مشائخ کو اپنے سے وابستہ کر کے ان کی سرگرمیاں کم کر دیں۔

مگر اس پر بھی اسے قرار نہ آیا۔ شیخ ضیاء الدین سمانی کو اس نے دلی سے نکال دیا۔ مولانا شمس الدین یحییٰ کو کشمیر چلنے کا حکم دیا۔ شیخ شہاب الدین نے خدمت سے انکار کیا تو سلطان نے ان کی داڑھی نچوائی۔ مگر انھوں نے خدمت قبول نہیں کی۔ سلطان نے انھیں چھوڑ دیا مگر پھر کچھ عرصے کے بعد بلا بھیجا اور انھوں نے پھر خدمت سے انکار کیا اور کہا "میں اس ظالم کی خدمت نہیں کروں گا۔" قاضی صدر الدین صدر جہاں کے یہاں مقدمہ پیش ہوا۔ شیخ نے سلطان کے ظلم کی مثالیں دیں۔ سلطان نے انھیں تکلیف دے دے کر مروا ڈالا۔ مستقیم کو یہ شدائد دیکھ کر

بڑا افسوس ہوا لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔"

مسلم کا یہ کام تھا کہ وہ حاضر خدمت رہے جو کچھ سلطان حکم دے اسے بجا لائے۔ اس قرب کی بنا پر اسے سلطان کی بہت سی نجی باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک روز قتلغ خاں کو سلطان نے بلوایا۔ وہ آیا تو بادشاہ شمع سے منہ موڑ کر اندھیرے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر دونوں خاموش رہے پھر بادشاہ بولا "فرض کرو کہ آج کوئی آدمی اٹھ کر یہ کہے کہ محمد پیغمبر تھے تو ہم اور تم کس دلیل سے اسے قائل کریں گے۔"

قتلغ خاں نے کافی دیر تامل کے بعد سخت لہجے میں کہا۔ "ایسے حرام زادے دیوانے احمق۔ بدبخت۔ بے دولت کے لئے دلیل کی کیا ضرورت ہے۔ اس وقت آپ کے اقبال سے ملک اور شہر میں اسلام نے اس طرح اقتدار حاصل کر لیا ہے کہ آپ کے غلام اسے جوتیاں مار مار کر فنا کر دیں گے۔"

اس پر سلطان نے سر جھکا لیا اور کچھ نہ کہا۔

پھر ایک دن منصور ملک سے اس نے سلطان کو کہتے سنا "حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے کیا کیا ہے جو ہم نہیں کر سکتے۔"

ملک منصور نے جواب دیا "وہ پاک لوگ تھے اور ہم پلید ہیں۔"

ایسے واقعات کے بعد مسلم اکثر یہ نتائج نکالتا تھا کہ محمد تغلق اسلام سے منحرف ہو رہا تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی دیکھتا کہ سلطان نماز کا بڑا پابند تھا اور شیخ عبدالعزیز اردبیلی کی بڑی عزت کرتا تھا۔

دوسری طرف شاہ نصیرالدین چراغ سلطان کی خدمت میں حاضری کے باوجود نظامی سلسلے کے کام کو فروغ دیتے رہے۔ انھوں نے خلفا کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں ہدایت کیلئے روانہ کیا۔ بادشاہ کی خدمت سے وقت نکال کر وہ درس دیتے تھے۔ وہ فرماتے "ایک مسئلہ تنہائی میں دیانتداری سے غور و خوض کرنا ریا اور غرور کی عبادت سے بہتر ہے۔" اکثر شیخ مباحثے

بھی کراتے اور ان کو پسند کرتے۔ شیخ کی صوفیانہ شان کے ساتھ علم و فضل کا ڈنکا بھی چار دانگ ہند میں بجا۔ عام طور پر لوگوں کو مسلم نے انھیں "امام ابو حنیفۂ وقت" کہتے سنا۔

سلطان زیادہ سے زیادہ پاگل ہوتا گیا۔ اس کی سب ترکیبیں بغاوتوں میں ختم ہو گئیں۔ اور حصوں میں بھی بغاوتیں شروع ہوئیں۔ بادشاہ ان کو فرو کرنے کے لئے جانے لگا۔ مسلم دلی میں رہا۔ آخر کو خبر آئی کہ ٹھٹھہ کے قریب اس کا انتقال ہو گیا۔ شیخ اس کے ساتھ ہی تھے۔

جب محمد تغلق دم توڑ رہا تھا تو شیخ کے سامنے اس کی جانشینی کا مسئلہ پیش ہوا۔ شیخ کا صبر و تحمل اب کام آیا۔ سلطان کے خدمت گار ہونے کا یہ صلہ ملا کہ سلطان گر پڑے گئے۔ آپ ان اکابر میں پیش پیش تھے جنھوں نے فیروز تغلق کو پیغام دیا۔ آپ نے فرمایا "وعدہ کرو کہ اپنے خلق سے مخلوق کے ساتھ عدل و انصاف کرو گے ورنہ ان بے کس بندگان خدا کے لئے اللہ تعالیٰ سے دوسرا فرماں روا طلب کیا جائے۔"

سلطان فیروز نے جواب دیا "میں خلقت خدا کے ساتھ حلم و بردباری کروں گا۔ اور اتفاق و محبت سے ان پر حکمرانی کروں گا۔"

حضرت شیخ نے فرمایا "اگر تم خلق خدا کے ساتھ خلق و مروت کرو گے تو ہم نے بھی تمہارے لئے خدا سے حکومت طلب کی۔"

اس واقعہ کے بعد مسلم کو محسوس ہوا کہ صوفیہ امتحان کے دور سے گزر گئے۔ شاہ چراغ کو وہ طاقت حاصل ہو گئی جو شیخ المشائخ کو حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ صوفیہ کا دور اب عروج پر پہنچا۔ مسلم دربار سے بالکل الگ ہو کر پورا صوفی ہو گیا۔ حضرت چراغ نے دلی ہی میں فیروز تغلق کی تخت نشینی کے چند سال بعد وفات پائی۔ ان کے خلیفۂ اعظم خواجہ بندہ نواز گیسو دراز حسب الحکم دکن تشریف لے گئے۔ مسلم بھی ان کے ساتھ گیا۔

حضرت سید محمد الحسینی الملقب بہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز مسلم صوفیہ میں پہلے شخص تھے جو سنسکرت سے بخوبی واقف تھے اور ہندو مذہب کا کامل علم رکھتے تھے۔ مسلم کے لئے ان سے

زیادہ مکمل انسان اب تک کوئی اور نہ ہوا تھا۔ ان کی ہمراہی میں مسلم گوالیار، تھانیسر، ایرچ، چندیری، بڑودہ ہوتا ہوا گجرات پہنچا۔ یہاں کچھ عرصہ تک قیام رہا۔ یہاں معلوم ہوا کہ دکن میں برہمنوں نے خاص طور پر شنکر آچاریہ کے اثر سے ایک نئی تحریک اٹھائی تھی۔ اس میں برہمن تھے جو مسلمانوں سے بحثیں کرتے اور بیراگی اور بیراگنیں تھیں جو وشنو بھگوان کے گن گاتی پھرتی تھیں۔ اس طرح عوام کے دل میں ہندو مت کو ایک نئی زندگی بخشی۔ خواجہ بندہ نواز نے سمجھ لیا کہ یہ تحریک تبلیغ اسلام کے خلاف تھی اور وہ اس سے لڑنے کے لئے پورے طور پر تیار تھے۔ وہ گجرات سے دولت آباد آ گئے۔

یہاں ایک روز کچھ پنڈت اور یوگی بحث کرنے کے لئے آئے۔ کچھ باتوں کے بعد یہ طے پایا کہ جو بحث میں کامیاب ہو اس کے مذہب پر دوسرے کو آنا ضروری ہوگا۔

خواجہ گیسو دراز نے کہا "پہلے آپ اپنی بات شروع کریں۔"

پنڈتوں اور یوگیوں نے کہا "نہیں پہلے آپ کہیں۔"

شاہ نے سنسکرت کی کتابوں سے مدلل بحث شروع کی ہندو مذہب کے تمام اصول بتا کر پوچھا "میں ٹھیک سمجھا ہوں؟"

پنڈتوں نے کہا "آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں۔"

شاہ نے پھر ہندو مت اور اسلام کا موازنہ کیا اور آخر میں کہا "اب بتاؤ کہ اسلام بہتر ہے کہ نہیں؟"

پنڈت لوگ حیران ہو کر ان کے سامنے سجدے میں گر گئے۔

آپ نے ان کو اٹھاتے ہوئے کہا "یہ سب بیکار ہے۔ اس طرح کسی آدمی کی پوجا بیکار ہے۔ اب تم کو معاہدے کے موافق اسلام لے آنا چاہیے۔"

ایک پنڈت بولا "میرے خاندان کے لوگ ہیں ان کو کیسے چھوڑ دوں؟"

دوسرا بولا "مگر ہمارے بزرگ جس راستے پر تھے اسے کیسے چھوڑ دیں؟ جو ان کے لئے ٹھیک

تھا ہمارے لئے بھی ٹھیک ہے۔"

شاہ صاحب نے ان کی لعنت ملامت کی مگر وہ نہ مانے۔

"ہندوؤں کو بدلنا بہت مشکل ہے" آپ نے فرمایا۔

شاہ صاحب کو سماع سے خاص دلچسپی تھی۔ مجلس سماع، جو شام کو برپا ہوتی اس میں ہندوؤں کو بھی آنے کی اجازت تھی۔ فارسی میں غزلیات کے ساتھ ہندی میں بھی گیت گائے جاتے تھے۔ اس سے بہت ہندو متاثر ہوئے اور بحثوں سے زیادہ تبلیغ کے لئے یہ ذریعہ مفید ٹھہرا۔ اکثر تو مسلم گیت گاتے پھرتے اور ان کے اثر سے بہت سے ہندو مسلمان ہوئے۔

کچھ عرصے کے بعد یہ خبر آئی کہ ایک بیراگن یا دوگا گاتی ناچتی ہوئی آئی ہے اور پورا شہر اس کے رنگ میں محو ہو گیا ہے۔ مسلم کو اسے دیکھنے کا بڑا شوق ہوا۔ وہ ایک درخت کے نیچے مقیم تھی جہاں گا گا کر ناچا کرتی اور لوگ اس کے چاروں طرف جمع ہو جاتے تھے۔ مسلم قریب پہنچا۔ وہ مٹکتی ناچ ناچ رہی تھی۔ گت باندھتے ہوئے وہ اس کی طرف آئی۔ وہ فوراً پہچان گیا۔ وہ [illegible] اُما پاروتی تھی۔ اس نے چاہا کہ بڑھ کر اس کو اٹھا لے مگر وہ اپنے ناچ میں محو تھی اور [illegible] کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔ ناچتے ناچتے اس کی نگاہ مسلم پر پڑی۔ وہ ناچ روک کر دنگ کھڑی رہ گئی۔ سب لوگ مسلم کو دیکھنے لگے۔

"اُما!" مسلم نے حسرت سے کہا۔

"مسلم؟" اُما نے کہا۔

دونوں ایک دوسرے سے سب کے سامنے لپٹ گئے۔ سارا مجمع دنگ دیکھتا رہا۔ اب دونوں ساتھ ساتھ رادھا کرشن ناچ ناچنے لگے۔ مسلم کے ہمراہی مسلمان بڑے تعجب میں آ گئے کہ یہ کیا ماجرا تھا۔ تماشائی سب یہ سمجھ کر کہ یہ اُن کے [illegible] سجدے میں گر پڑے۔ کچھ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے حضرت [illegible] تمام حال بیان کیا۔

حضرت گیسودراز نے فرمایا "میں جانتا ہوں۔ وہ ان کی منکوحہ ہے جو کھو گئی تھی اور جس کی وہ تلاش میں تھے۔ شکر خدا کا کہ دونوں مل گئے۔"

مگر اس واقعہ پر ہندوؤں نے بڑا شور مچایا۔ بیراگی چلائے "ایک مسلمان صوفی ہمارے بیراگن کو بھگا لے گیا۔" پنڈتوں کا ایک گروہ حضرت گیسودراز کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے ان سے مسلم اور آما کا سارا واقعہ سنایا۔ وہ لوگ یقین نہ کر سکے۔ آما اور مسلم ان کے سامنے پیش ہوئے۔ آما نے کہا "میں اس کی تلاش میں ہی پھر رہی تھی۔ چتوڑ سے راستہ بھول کر ادھر آ گئی تھی۔ اب یہ مجھ کو مل گیا۔ میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مگر عام لوگوں کو نہ سمجھا سکے۔ خاص طور سے بیراگی لوگوں کے لئے آما بہت قیمتی تھی۔ اس کا حسن اس کا فن ان کے لئے بڑے فائدے کی چیزیں تھیں۔ وہ لوگ ایک گروہ بنا کر حضرت گیسودراز کے گھر پر چڑھ آئے۔ شہر میں بدامنی اور فساد کا ڈر پیدا ہوا۔ سرکاری حکام کو خبر دی گئی۔ آخر کو یہ طے ہوا کہ آما اور مسلم اپنے وطن واپس چلے جائیں۔

ایک گھوڑے پر مسلم اس کے پیچھے ڈولے میں آما اس کے پیچھے ایک مزدور سامان لئے ہوئے رات کے اندھیارے میں جاتے دکھائی دیئے اور کچھ دیر کے بعد تاریکی میں غائب ہو گئے۔

۲

مسلم پانی پت میں مقیم تھا کہ وہاں خواجہ شیخ احمد ردولوی تشریف لائے۔ شیخ ہدایات میں مصروف تھے۔ وہ ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ انھوں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ ردولی پہنچا اور شیخ کے عطا کئے ہوئے ایک مکان میں رہنے لگا۔ آما گھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ وہ شیخ کی خدمت میں حاضر رہتا اور ہر قسم کی ہدایات حاصل کرتا رہتا۔ شیخ محویت کے عالم میں رہتے۔ انھیں دنیا اور اہل دنیا سے سخت نفرت تھی۔ اگر ان کے سامنے کوئی اہل دنیا میں سے آتا تو ان کے جسم مبارک پر لرزہ پڑ جاتا۔ وہ جامع مسجد میں سب سے پہلے جاتے اور خود جھاڑو دیتے۔ نماز میں محو ہو جاتے۔ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے۔

سخے شکستہ است از ہمہ عالم برائے یار
آرے برائے یار دو عالم تواں شکست

محویت کا یہ عالم تھا کہ گھر والوں اور اقربا کو بھی نہ پہچانتے۔ نماز کے وقت جب کوئی بھی قریب ہوتا تین مرتبہ حق حق حق کی آواز بلند کرتا تو ان کی آنکھ کھلتی لیکن پھر نماز میں محو ہو جاتے۔

مریدوں سے بہت محبت کرتے تھے اور فرماتے تھے "حق تعالیٰ نے مجھے

لوگوں کی فہرست عنایت فرمائی ہے جو مجھ سے مرید ہوں گے" اور کبھی فرماتے: "مریدوں کے حق میں میری حمایت ایسی ہے جیسی آسمان کی حمایت زمین کے حق میں رقم ہے۔ جب تک میرے دوست اور مرید جنت میں نہ جائیں گے میں ہرگز جنت میں نہ جاؤں گا۔"

ایک روز ایک برات جا رہی تھی۔ شیخ کی نظرِ جلال اس پر جا پڑی۔ پوری برات جل بھن کر ڈھیر ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد عالمِ جلال ختم ہوا اور انھوں نے نظرِ جمال اس برات پر ڈالی۔ سب زندہ ہو گئے۔ اس کرامت کے بعد ان کی محبوبیت اور بھی بڑھ گئی۔ پھر ایک روز ایک مُردہ پاس سے گزرا۔ انھوں نے "قُم بِاذنِ اللہ" کہا۔ وہ مردہ زندہ ہو گیا۔ کئی بار ایسا ہوا۔ ہر طرف شور برپا ہوا۔ شیخ ردولی سے روپوش ہو گئے۔ مسلم کو بھی حکم ہوا کہ وہ سنگم پور واپس جائے اور وہاں عبادت میں مصروف رہے۔

مسلم کے لئے شیخ احمد ردولوی کی ذات تصوف کا کمال تھی۔ یہ تصوف کی وہ حد تھی جو دنیا اور مافیہا سے ترک کو آخری درجہ پر پہنچاتی تھی۔ سنگم پور گراں ہی کا سا بننے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے ایک چھوٹی زمینداری حاصل کر لی تھی جس کا تمام انتظام آما کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خود حجرے میں بیٹھا رہتا۔ علما و درویش لوگ آتے رہتے۔ کچھ شاگرد بھی ہو گئے تھے جن کو مختلف علوم کا درس دیتا۔ نماز اور روزہ کا پابند ہو گیا تھا۔ گھر کے پاس ہی مسجد بنائی تھی جہاں کی نماز میں لوگ اس کے پیچھے نماز پڑھتے۔ نماز کے بعد حجرے میں جا کر مصروفِ عبادت رہتا۔ اور مغرب کے بعد باہر آتا۔ اکثر آما اس کے پاس آتی اور حافظ کی غزلیں پڑھ کر یا گا کر سناتی۔ وضو کر کے کھانا کھاتا اور عشا کی نماز کو تہجد سے ملا دیتا۔ اس کے بعد آما کے پاس آ کر لیٹ رہتا۔ دونوں صبح نماز کے وقت اٹھتے۔ نہا دھو کر نماز فجر ادا کرتے۔ مسلم وظیفہ پڑھتا ہوا اپنے حجرے میں آ جاتا۔ آما چکی پیسنے بیٹھ جاتی۔ ان کی زندگی یونہی گزرتی رہی۔

۳

صبح ہونے سے قبل بنارس میں گنگا کے کنارے مسلم اور آما کھڑے تھے۔ انھیں سوامی رامانند کے آنے کا انتظار تھا۔ دونوں بار بار گنگا کے پاٹ کو دیکھتے اور مڑ مڑ کر سیڑھیوں کے چبوترے پر نظر ڈالتے۔ سیڑھیوں پر اندھیرا تھا۔ اتنے میں سوامی جی چبوترے پر آ گئے۔ سیڑھیاں اترنے لگے۔ کئی سیڑھیاں اترنے کے بعد اُدھم سے رام رام کہہ کر رک گئے۔ سیڑھی پر سے دھندلکے میں ایک آدمی اٹھ کر ان کے قدم چھوتا دکھائی دیا۔

پھر آواز آئی "سوامی جی میں رسم کے مطابق آپ کا چیلا ہو گیا۔"

"مگر تم مسلمان ہو۔ شیخ محمد تقی کے مرید" جواب سنائی دیا۔

"یہ تو بھگوان آپ ہمیشہ کہتے رہے ہیں اور مجھے اپنا چیلا بنانے سے انکار کرتے رہے۔ مگر میں آج آپ کا چیلا ہو گیا۔ ہری کی مرضی ہے۔ ہری اوم تت ست۔"

پھر دونوں گلے ملتے دکھائی دیے۔ دونوں نے ساتھ ساتھ اشنان کیا۔ آما اور مسلم نہائے۔ صبح ہو گئی۔ صبح بنارس! گنگا کی طرف سے عجیب پرکیف ہوا چلی۔ مندروں کے گھنٹے بڑے سریلے راگ کے ساتھ بجنے لگے۔ سورج نکلا۔ مندروں کی سونے کی چوٹیاں چمکنے لگیں۔ ان کا عکس دریا میں پڑ کر نہایت نورانی روشنیوں میں تبدیل ہوا۔ سینکڑوں لوگ آ آ کر نہانے

گے۔ ہر گنگا۔ ہر گنگا کی آواز گھنٹوں کی آواز سے ہم آہنگ ہونے لگی۔ سوامی رامانند اور ان کا نیا چیلا، اشنان اور پوجا کرنے کے بعد چبوترے پر بیٹھ گئے۔ لوگ آ آ کر ان کے پیر چھو چھو کر جانے لگے۔

"یہ تو وہ جولاہا کبیر ہے" ایک طرف سے مسلم کے کان میں آواز آئی۔

"یہ تو مسلمان ہے" ایک اور طرف سے آواز آئی۔

"سوامی جی کا چیلا ہو ہی گیا۔ بہت پھرتا تھا پیچھے پیچھے" ایک آواز آئی۔

سوامی جی جانے لگے تو بآواز بلند بولے "یہ کبیر آج سے میرا چیلا ہے۔ تم سب کو اس کی عزت میری طرح کرنا چاہیے۔ یہ میرا ہونہار چیلا ہوگا۔"

آما سوامی جی کے پیر چھونے میں مصروف تھی۔ مسلم کبیر کے پاس آیا اور بولا "آپ نے مجھے پہچانا؟"

"ہاں مسلم۔ خوب۔ تو تم نے وہ سب ڈھونگ چھوڑ دیا؟"

"اس پیاری روحانیت سے دل گھبرا گیا۔"

"اچھا تو تم دونوں میرے ساتھ میرے گھر چلو۔"

آما اور مسلم دونوں کبیر کے ساتھ گئے۔ ان کا ایک چھوٹا سا کچا گھر تھا۔ ایک حصہ میں چرخہ رکھا ہوا تھا اور کرگھا لگا ہوا تھا۔ گھر کے اندر ان کی بیوی لوئی کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ آما اس کا ہاتھ بٹانے میں لگ گئی۔ کبیر کرگھا چلانے لگے۔ مسلم چرخہ کاتنے لگا۔

پھر چاروں نے مل بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کبیر کپڑا دینے بازار چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں واپس آئے۔ وہ اور مسلم آمنے سامنے بیٹھے۔ کبیر نے اپنا دوہا سنایا۔

دوئی جگدیش کہاں تے آئے کہو کون بھرمایا
اللہ رام کریم کیشو حضرت نام دھرایا
وہی مہادیو وہی محمد برہما آدم کہیے
کوئی ہندو کوئی ترک کہاوے ایک زمیں پر رہیے

وید کتاب پڑھے وے کتبا مُلّا ہی پانڈے
بگت بگت کے نام دھرایو ایک ماٹی کے بھانڈے

مسلم جھومنے لگا۔ اندر آما اور لوئی کے ہنسنے اور گانے کی آواز آئی۔ لوئی ایک خاص بھجن میں گا رہی تھی اور آما اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ کچھ باہر کے لوگ جمع ہو گئے۔ بار بار یہ دوہا پڑھا گیا۔ اکثر لوگوں کو یاد ہو گیا۔ وہ لوگ گنگناتے ہوئے چلے گئے۔ شام کے وقت کبیر اور مسلم ٹہلنے نکلے تو بستی میں جدھر گئے اسی دوہے کی آواز سنائی دی۔ اکثر لوگ کبیر کے پاؤں چھوتے اور چلے جاتے۔ ایک جگہ پر ایک اور دوہے کے گانے کی آواز آئی۔ دونوں رک کر سننے لگے۔

پاہن پوجے ہر ملیں تو میں پوجوں پہار
تاتے یہ چاکی بھلی پیس کھائے سنسار

مسلم اس کو گنگنانے لگا۔ اُسے یاد ہو گیا۔

گھر واپس آ کر دونوں باتیں کرتے رہے۔ اس کے درمیان یہ بات چھڑی کہ سب سے زیادہ نیک کام کون ہے۔ کبیر نے اپنا دوہا سنایا

ہری سے تو جن ہیت کر ہر جن سے کر ہیت
مال ملک ہری دیت ہیں ہر جن ہری ہی دیت

"مگر اس کام کے لئے انسان اپنے کو موزوں کیسے بنائے؟" مسلم نے پوچھا

کبیر نے جواب دیا:

کامی کرودھی لالچی ان سے بھگت نہ ہوئے
بھگتی کرے سو سورما جاتی برن کل کھوئے

کبیر کسی رسم میں عقیدہ نہ رکھتے تھے اور نماز روزے کے بھی قائل نہ تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ظاہر داری پر بھی انھوں نے مسلم کو اپنے دوہے سنائے۔

سائیں سے سانچا رہو سائیں سانچ سہائے　　بھاویں لمبے کیس رکھ بھاویں گھوٹ منڈائے

نہانے دھوئے کیا بھیا جو من میل نہ جائے
مین سدا جل میں رہے دھوئے باس نہ جائے

کبھی کبھی کبیر خود بھی اپنے دوہے گاتے نکلتے اور مسلم ان کے ساتھ گاتا جاتا۔ اکثر وہ مندر یا مسجد کے پاس سے گزرتے تو کبیر آواز بلند یہ دوہا گایا کرتے۔

مالا پھیرت جگ بھیا پائے نہ من کا پھیر
کر کا منکا ڈار دے من کا من کا پھیر

ایک دفعہ مسجد میں سے ایک سر منڈے ہوئے مولانا نکلے۔ پھر آگے بڑھ کر ایک گروہ سر منڈے پنڈتوں کا نظر آیا۔ کبیر نے یہ دوہا کہا۔

مونڈ مونڈائے ہر ملیں سب کوئی لئے مڑائے
بار بار کے مونڈتے بھیڑ نہ بیکنٹھ جائے

کچھ دنوں رہ کر مسلم اپنے مقام پر واپس آیا۔ اب وہ خود اپنے کھیتوں میں کام کرتا اور کبیر کے دوہے گایا کرتا۔ وہ عالم رہ چکا تھا۔ مگر اب وہ زیادہ تر یہ گایا کرتا۔

پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا پنڈت بھیا نہ کوئے
ڈھائی اچھر پریم کے پڑھے سو پنڈت ہوئے

پریم اس کا بھی مسلک ہو گیا۔ اپنے کام سے فراغت کر کے وہ اور آما خدمت خلق کرتے۔ چلتے کسی بیمار کی تیمارداری کرتے، کسی بھوکے کو کھانا کھلاتے، کسی زچہ کی آما دیکھ بھال کرتی۔ کسی بدمعاش کی اصلاح میں مسلم لگتا۔ یہی ان کی زندگی کا کام ہو گیا۔ اس کے قبضے میں جتنے گاؤں تھے سب میں پریم کا راگ گایا جانے لگا۔ قریب قریب کے گاؤں کے لوگ اس کے گاؤں میں آ آ کر بسنے لگے۔ کبیر کی طرح کافی عرصہ تک وہ مذہبی رسم و رواج کی کھلے بندوں مذمت کرتا۔ ہندو اور مسلمانوں کو یکساں طور پر پھٹکارتا۔ مگر دریا کو توڑنے اور حق اور سچائی کے پھیلانے میں اس نے بھی بڑی کامیاب کوشش کی۔

ایک دن اس نے سنا کہ بادشاہ وقت سکندر لودی نے کبیر کو قتل کی سزا دی ہے وہ خود بنارس پہنچا۔ لوگ مغموم تھے۔ مگر کبیر بالکل مطمئن تھے۔ بنارس کے قاضی نے سزا میں یہ ترمیم کر دی کہ کبیر کو کشتی میں بٹھا کر غرق کر دیا جائے۔ ایک دن ان کو زنجیروں میں جکڑ کر دریا کے کنارے لایا گیا۔ جو بھی انھیں اس حالت میں دیکھتا تھا ساتھ ہو لیتا تھا۔ مگر سرکاری سورماؤں کے ڈر کے مارے کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ کبیر کو ایک کشتی میں بٹھایا گیا اور زنجیر کو کشتی سے کس دیا گیا۔ کشتی کھیتی گئی۔ منجھدار میں لا کر اس میں پتھر بھرے گئے۔ ملاح تیرتے ہوئے الگ ہو گئے۔ کشتی ڈوبتی ہوئی نظر آئی۔ ڈوب گئی۔ کنارے پر دیکھنے والے رونے لگے۔ سرکاری ملازم چلے گئے۔ اس کے تھوڑی دیر کے بعد کبیر تیرتے ہوئے کنارے پر آتے نظر آئے۔ کنارے پر آئے سب لوگ خوشی سے اچھل اچھل پڑے۔ سب خوشیاں مناتے ہوئے انھیں گھر پہنچا گئے مسلم ان کے ساتھ رہا۔

حکومت کے ملازمین کو خبر ہوئی تو ان کو پھر پکڑ کر قاضی کے سامنے لایا گیا۔ قاضی نے حکم دیا کہ انھیں آگ میں جلایا جائے۔ وہ آگ میں چھوڑے گئے۔ مگر آگ بجھ گئی اور وہ سلامت نکل آئے۔ پھر شہر بھر نے خوشیاں منائیں۔

پھر ان کو پکڑا گیا اور اس مرتبہ ان کو ہاتھی کے سامنے ڈال دیا گیا۔ ہاتھی مست تھا مگر ان کو دیکھ کر بھاگ گیا۔ اب عوام میں اتنا زور آ گیا کہ وہ بغاوت کے لئے تیار ہو گئے۔ اس پر ان کو شہر بدر کرا دیا گیا۔ وہ مگہر میں جا بسے۔ مسلم اپنے گھر آیا۔ اس نے اپنے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس زمانے میں لوگ کاشی کو جنت اور مگہر کو دوزخ کہتے تھے۔ کبیر نے اس پر بھی ایک دوہا کہا۔

کیا کاشی کیا اوسر مگہر، رام ہردے بس مورا
جو کاشی تن تجے کبیرا، رامے کون نہورا

سکندر لودی کی حکومت ختم ہو گئی۔ عوام کے علاوہ بہت سے راجہ کبیر کے پیرو بن گئے

کبیر پنتھی نام کا ایک فرقہ بن گیا۔ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ مسلم نے سُنا کہ شاید اب
گرو نانک بابا بھی آ کر کبیر سے ملے تھے۔ انھوں نے ایک فرقہ قائم کیا جو سکھ کہلاتا تھا اور جو
ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملانا چاہتا تھا۔ مسلم مگھر بھی جاتا رہا اور کبیر کے نئے نئے دوہے لکھ کر لاتا رہا۔
ان میں زیادہ تر نصائح تھے اس دوہے کو جو جھوٹ کے خلاف ہے اس نے خوب مقبولیت دی

سانچ برابر تپ نہیں جھوٹ برابر پاپ
جا کے ہردے سانچ ہے تا کے ہردے آپ

دوسری برائیوں کے خلاف بھی ایک دوہا اس نے اپنے تمام کسانوں کو سکھایا:

جوا چوری مخبری بیاج گھوس پرنار
جو چاہے دیدار کو اتو بسنو بچار

اس نے دوسروں کی برائی کرنے سے بھی لوگوں کو روکا اور اس سلسلے میں یہ دوہا یاد کرایا:

بُرا جو دیکھن میں چلا بُرا نہ دیکھا کوئے
جو دل کھوجوں اپنا مجھ سا بُرا نہ کوئے

اب اسے محسوس ہوتا کہ وہ اور آما ایک جان اور دو قالب ہو گئے ہیں۔ آما
کے پاس بیٹھ کر وہ عجیب کیف میں گم ہو جاتا۔ کبیر کے ذکر سے وہ دونوں روحانی طور پر ایک
ہو گئے تھے آما کو زیادہ تر وہ دوہے یاد تھے جن میں کبیر نے محبت کا اظہار کیا تھا اکثر وہ ناچ
ناچ کر یہ دوہا گاتی۔

پریتم کو پتیاں لکھوں جو کہوں ہوئیں بدیس
تن میں من میں نین میں تا کو کہاں سندیس

آخری دور کے تو دوہے مسلم لکھ کر لایا ان میں بے ثباتی کا ذکر زیادہ تھا۔ جیسے

ماٹی کہے کمہار سے تو کیا روندے موہے
ایک دن ایسا ہوئے گا میں روندوں گی توہے

اس کے بعد خبر آئی کہ کبیر مگھر پہنچا۔ وہاں ہندو مسلمان برسرِ پیکار ہے۔ فوت ہوئی
ہو چکی تھیں ہر ایک گروہ اپنے طریقہ پر ان کا آخری کام کرنا چاہتا تھا مسلم نے تقریر کی
اور کہا: جس ہستی نے تم کو ملانے کی کوشش کی اس کی روح کو تم اس طرح لڑ کر تکلیف دے رہے ہو۔
تو پھر ہم کیا کریں؟ سوال اٹھا۔
مسلم نے جا کر کبیر کا کفن ہٹایا نعش کی جگہ پر پھول نظر آئے سب لوگ متعجب ہو کر
دیکھنے لگے۔ پھولوں کو آدھا آدھا دونوں قوموں میں تقسیم کر دیا گیا مسلمانوں نے پھولوں کو
مگھر میں دفن کیا۔ ہندو پھولوں کو کاشی لے گئے اور وہاں جلایا۔ مسلم اپنے گھر واپس چلا۔ کبیر نے
اس کی زندگی بالکل بدل دی تھی۔ وہ راستے بھر یہ دوہا گاتا رہا۔

لالی مورے لال کی جت دیکھوں تت لال
لالی دیکھن میں گئی میں بھی ہو گئی لال

گھر پہنچا تو وہ بڑا غمگین تھا۔ آما سے سارا حال بیان کرنے کے بعد اس نے یہ
دوہا پڑھا:

سانجھ پڑے دن بیتو ہے چکوی دینی روئے
چل چکوا وا دیس کو جہاں رین کبھو نہ ہوئے

آما اسے دھن سے گانے لگی دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔
مسلم اب جولاہوں کا سا لباس پہنے رہتا تھا۔ سر پر دوپلی ٹوپی۔ بدن پہ گاڑھے
کا لمبا کرتا اور تہمد۔ پیروں میں کھڑاؤں۔ اس کے نیچے میں فرق آ گیا تھا۔ وہ منتظم اور سپاہی رہ
چکا تھا مگر اب وہ کبیر کے اس دوہے پر عامل تھا۔

ایسی بانی بولئے من کا آپا کھوئے
اوروں کو سیتل کرے آپو سیتل ہوئے

دیوان نرشیں مہاراجہ انسپٹیا تھ سنگھ نے اس سے خاص تعلقات بڑھانے کے

Scanned with CamScanner

گزشتہ جنگ کی تشریح میں اس نے مہاراجہ کا ہاتھ بٹایا۔

دلی میں حکومتیں بدلتی رہیں۔ لودیوں اور شرقیوں سے جنگیں بھی ہوتی رہیں اسے ان سے کوئی سروکار نہ ہوا۔ اس کا سپاہی کا کردار بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اس کے نغموں نے کبیر کے اثر سے بالکل نیا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ شاید وہ پورا مسلم نہ رہ گیا تھا۔ کہاں سے کہاں پہنچا تھا۔ مگر اس کی زندگی ایک نئے کیف سے معمور ہو گئی تھی۔ ستر برس محبت سے وہ عجیب کیف محسوس کرتا اور آتما کو دیکھ کر ایسا محو ہوتا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اس عالم میں کافی عرصہ نہ گزرا تھا کہ بابر کی ابراہیم لودی سے جنگ کی خبر سنائی دی۔ وہ سمجھتا تھا کہ مسلمان بادشاہوں کا دور ہندوستان میں ختم ہو گیا۔ الگ الگ ریاستیں کبھی ایک نہ ہوں گی مگر بابر کی قلیل فوج نے ابراہیم کی کثیر فوج پر فتح پائی۔ کیسے؟

" بابر کے پاس توپ خانہ ہے اور اسے جنگ کی تنظیم آتی ہے۔" اسے بتایا گیا۔

" جنگ کی تنظیم نئی چیز ہے۔ ہماری فوج تو بس لڑ پڑتی تھی۔ جوش میں اللہ اکبر کہہ کر پل پڑتی تھی۔"

" وہ لڑائی کفار سے تھی۔ اب دونوں طرف سے اللہ اکبر کی صدائیں آکر ختم ہو جاتی ہیں۔ اب زور بازو کی جوش عقیدت کی لڑائی نہیں رہ گئی۔ اب دماغ کی دماغ سے لڑائی ہے۔ ابراہیم لودی کی فوج میں قریب ایک لاکھ آدمی تھے۔ اور ہاتھی تھے۔ بابر کی فوج میں کوئی [illegible] آدمی بھی نہ ہوں گے۔ مگر بابر نے جنگ کا نقشہ خوب بنایا تھا۔ ایک طرف پانی پت کا گاؤں دوسری طرف جنگل جس کے ادھر کھائیاں کھدوا دی تھیں۔ بازوؤں سے اس کی فوج پر حملے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ اپنی فوج کے آگے اس نے توپ خانہ لگایا تھا اور توپخانے کے پیچھے چھکڑے اور ٹھیلوں کی قطار لگائی تھی جو موٹے رسوں سے جوڑے ہوئے تھے۔ لودی کی فوج حملہ کیسے کرتی۔ گھوڑے رتھوں میں پھنس جاتے۔"

" اور بابر کے سوار ان میں نہیں پھنستے۔"

" وہ ٹھیلوں کے بیچ کے رستے کھول کر اطمینان سے ادھر آتے پھر رستے باندھ دیتے۔"

" خوب بڑی اچھی تدبیر تھی۔ خوب۔ خوب۔"

" تو یہی کیا گیا تھا۔ ابراہیم لودی کی فوج پر بابر کی فوج کے دستے پہلوؤں سے حملہ آور ہوئے۔ ہاتھی توپ خانے کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکے پہلوؤں میں یہ فوج تھی۔ ابراہیم لودی کی فوج کو سوائے بھاگنے کے اور کچھ رہ ہی نہ گیا۔"

" بابر ایک نیا دور شروع کر رہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں اس نے سپاہ گری کا فن ہی بدل دیا۔ وہ ضرور پھر پورا ہندوستان ایک کر دے گا۔"

" راجپوت رانا سنگرام سنگھ کی ماتحتی میں سیکری کے مقام پر جمع ہیں۔ بابر کی فوج کو پہلے تو کچھ خوف ہوا۔ بابر نے زوردار تقریر کی۔ شراب کے قرابے اور شیشے توڑ ڈالے۔ فوج نے جوش میں آکر حملہ کیا۔ راجپوت بھاگ گئے۔"

" اب وہ ادھر بھی فوج لے کر آئے گا۔"

" آگرہ کے کنارے اس نے ایک اور بڑی توپ ڈھلوائی اور پھر ایک نئی تنظیم سے تمام افغان سرداروں کو شکست دیدی۔ اب پورا ہندوستان اس کا ہے۔"

یہ خبریں سن کر مسلم کی فطرت میں دبا ہوا سپاہی پھر ابھرا۔ مگر وہ بیراگی ہو چکا تھا کہنے لگا۔ ہمیں کیا مطلب ہے

رموز مملکت و ملک خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

کچھ ہی دن میں اس کی مختصر زمینداری کی مالگذاری بابر بادشاہ کے نام سے وصول ہوئی۔ نیا سکہ آیا جس پر بابر بادشاہ لکھا تھا۔ سلطان کا لفظ متروک ہو گیا۔ سلطانوں کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اب ایک نئے شاندار حکمرانوں کا دور شروع ہو رہا تھا جو بادشاہ کہلائیں گے۔

آگرہ کی یہ خبریں نہ جانے کیوں اس کا دل دھڑکانے لگیں۔ وہ سپاہی کی جوانی جا رہی تھی مگر

یہ نئی زندگی اسے بہت ہی پسند تھی۔ مسلم کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ پھر سپاہی ہو جائے گا۔

اس کے مذاق میں بھی ایک خاص تبدیلی نمایاں ہو رہی تھی۔ فردوسی، عنصری، خاقانی کی فارسی شاعری کا دور جا چکا تھا۔ تصوف کی تحریک نے سعدی، رومی اور حافظ کے کلام کو ابھارا تھا۔ یہ کلام اسے کبیر کے دوہوں سے زیادہ دلکش معلوم ہوتا تھا۔ حافظ کی بہت سی غزلیں اسے حفظ ہو گئی تھیں اور وہ انھیں گنگنایا کرتا۔ رومی کی مثنوی وہ اکثر پڑھتا اور اس سے اس کا طرز فکر بدلنے لگا تھا۔ سعدی کی گلستاں اور بوستاں اسے ایک نئے انداز کا درس دینے لگی تھیں۔ تصوف اور بھگتی کے بجائے اس کو ایک نئی تہذیب اور نئے فن کا احساس پیدا ہونے لگا تھا۔ بابر ہندوستان میں ایک نیا دور لایا تھا۔ ایک نئے ادب اور ایک نئے ادبی ذوق کا دور جو اپنے اندر مذہب کو جذب کر کے نیا رنگ دکھانے والا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اب نہ تارک الدنیا تھا اور نہ کبیر پنتھی بلکہ اس کو پھر بادشاہوں کے حالات میں دلچسپی ہونے لگی تھی۔ دل کی دنیا اب پھر اس کی توجہ کا مرکز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ آنا سے حافظ اور خسرو کی غزلیں گانے کی فرمائش کرتا اور ان کو سن کر وجد میں آ جاتا۔

ایک دن وہ آنا کے ساتھ آ کر سنگم کے پاس کھڑا ہوا۔ اسے وہ زمانہ یاد آیا جب حاکم کی حیثیت سے اسے دیکھا کرتا تھا۔ اب وہ تربینی کے روحانی تصور میں گم ہو جانے کا عادی ہو گیا تھا۔ مگر اس وقت اس کے پرانے احساس کی ایک لہر اس کے دل پر دوڑ گئی اور اس کا سر جو جھکا رہنے کا عادی ہو چکا تھا اکدم شان کے ساتھ اٹھ گیا۔ آنا نے اسے محبت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس نے آنا کو اسی طرح گود میں اٹھا لیا جیسے کہ سپاہی گیری کے زمانے میں اٹھا لیا کرتا تھا۔

اس رات کو وہ اپنے گھر کے چھوٹے صحن میں چاندنی میں آنا کو اپنی گود میں لیے ٹہلتا رہا۔ آنا حافظ کی غزل گاتی رہی۔

صلاح کار کجا و من خراب کجا — ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا
دلم ز صومعہ بگرفت و خرقہ سالوس — کجاست دیر مغاں و شراب ناب کجا
چہ نسبت است بہ رندی صلاح و تقوی را — سماع وعظ کجا نغمہ رباب کجا
ببیں بہ سیب زنخداں کہ چاہ در راہ است — کجا ہمی روی اے دل بدیں شتاب کجا
چو کحل بینش ما خاک آستان شماست — کجا رویم بفرما ازیں جناب کجا

قرار و خواب ز حافظ طمع مدار اے دوست
قرار چیست صبوری کدام و خواب کجا

دوسرے دن اس نے سنا کہ بابر کے ڈر سے سنگم کے قلعہ کا افغان ملک بھاگ گیا۔ اس نے اپنے گاؤں کے لٹھ بندوں کو جمع کر کے قلعہ پر یورش کی اور قبضہ کر لیا۔ اب پھر اس کی وہی زندگی واپس آ گئی جو علاء الدین خلجی کے زمانے میں تھی۔ اب تک اس نے سب سے زیادہ شاندار دور علاء الدین کا دیکھا تھا۔ اب وہ دور پھر واپس آتا معلوم ہو رہا تھا۔ بابر کے سپاہی اس کے پاس آئے تو اس نے بلا عذر اطاعت قبول کر لی اور خراج کی رقم فوراً ادا کر دی۔

ایک روز ردولی سے ایک صاحب اس کے پاس آئے۔ انھوں نے بتایا کہ فخر خواجگان قطب العالم حضرت خواجہ شیخ عبد القدوس جو ردولی چھوڑ کر شاہ آباد چلے گئے تھے، بابر کے حملے کے بعد معہ اہل و عیال گنگوہ میں متوطن ہو گئے۔

مسلم نے ان بزرگ صوفی کے حالات پوچھے تو ان صاحب نے کہا "موضع [illegible] میں آپ تشریف لے گئے اور فرمایا" اے لوگو، جلد اپنے گھروں سے نکلو اور اپنے اسباب زندگی کو بچا لو کہ تمھارے گاؤں میں آگ لگنے والی ہے۔" پس آپ کے حسب الارشاد موضع کے ساکنان نے عمل کیا اور اپنے اہل و عیال و اسباب و مواشی لے کر گھروں سے نکل گئے۔ ایک ساعت نہ گزری تھی کہ غیب سے آگ پیدا ہوئی اور سارا موضع جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔"

"ویسے تو شیخ احمد حق کی طرح رہتے ہیں۔"

مستحکم ہو چکا ہے کہ مغل لوگ اس ملک کے مسلمان نہیں ہیں جیسے اس کے ساتھ آئے تھے آئے تو ہیں یہ سپاہی کی حیثیت سے گر تہذیب کے سپاہی ہیں۔ جن جہاں بانی تہذیب کا رنگ بڑا ہو گا ہے اور جو ہندوستان کے اثرات قبول کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسے دلی جا کر ہمایوں کے دربار میں حاضری دینے کا شوق ہوا۔ اس نے آ کے کہا۔ آنا کو رقیہ کا زمانہ یاد آیا۔

"مگر ان مغلوں کی مستورات کیسی ہیں؟"

"ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم خاص طور پر قابل ہیں۔ ہمایوں نامہ لکھ رہی ہیں۔"

"فنون جنگ۔ رقص و سرود سے شوق نہیں؟"

"یہ نہ معلوم ہو سکا۔ مگر صاحب علم اور صاحب ذوق ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔"

دونوں چلنے کے ارادے ہی کرتے رہے کہ شیر خاں افغان کی فوج بہار سے دلی کی طرف جاتی ہوئی گزری۔ کچھ عرصے کے بعد خبر آئی کہ شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو بھگا دیا ہے۔ بابر کے بھائیوں نے اسے پناہ نہ دی اور وہ بھاگ کر ایران پہنچا۔ مغل حکومت ختم ہو گئی۔

شیر شاہ سوری کی حکومت میں نئے انتظامات ہوئے۔ بابر کے خاندان کی حکومت تو قائم رہی تھی۔ مگر بابر کا ذہن حکومت کر رہا تھا۔ تنظیم، انتظام، قانون کا دور دورہ شروع ہو گیا تھا۔ اب بادشاہ کو محض سپاہیوں سے حکومت نہیں کرنا تھی۔ بلکہ کوتوالی اور مالگذاری کا نیا انتظام شروع ہوا تھا۔ اس انتظام نے مسلم کو بھی حکومت کا ایک پرزہ بنا دیا۔ اسے پہلے حلقے کی پیمائش کرانا پڑی اور اسی کے مطابق مالگذاری کا تعین کرنا پڑا۔ جرائم کی روک کے لئے گاؤں کے مقدم کو ذمہ دار بنایا۔ ہر جرم پر مقدم پکڑا گیا اور آخر کو جرم کھل گیا۔ یہ ہوتا رہا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک بوڑھی عورت سونا لئے ہوئے جہاں چاہتی جاتی اور کوئی اسے نہ ستاتا۔ امن کا ایک خاص طور دور آ گیا۔ شیر شاہ زیادہ تر جنگوں میں مصروف رہا مگر اس کے مقرر کئے ہوئے منتظمین اپنے کاموں میں مستعد رہے۔ بابر نے ہندوستان میں آ کے نئی روح پھونکی تھی شیر شاہ اسی کے اثر میں تھا۔ علاؤ الدین خلجی کے بعد اس سے زیادہ منتظم بادشاہ نہیں تھا

بہت زور ہو رہا ہے۔ ویسے تو قدیم اسلوب رہتے ہیں اور دستار و کلاہ بھی پہنی جاتی رہتی ہے۔ مگر سنت پیغمبر کی متابعت میں نہایت راسخ ہیں۔"

"صوفیا اب فقہ کی طرف آ رہے ہیں؟"

"خواجہ صاحب اپنے صاحبزادے رکن الدین کو قانون کی تعلیم دلا رہے ہیں۔"

"وجدان میں عقل شامل ہو رہی ہے۔"

پھر ایک دن ایک صاحب نے آ کر ظہیر الدین بابر بادشاہ کی موت کی خبر دی۔ ہمایوں سخت بیمار پڑا۔ اطباء نے جواب دے دیا۔ صوفیوں نے خیرات کرنے کو کہا۔ امراء نے صلاح دی کہ کوہ نور ہیرا خیرات کر دیا جائے۔ مگر بابر نے کہا ہمایوں کے لئے میں اپنی جان خیرات کروں گا اور یہ کہہ کر ہمایوں کے پلنگ کے چاروں طرف سات بار پھرا اور پھر نماز پڑھنے بیٹھ گیا۔ وہ بیمار ہوتا گیا اور ہمایوں کو صحت ہوتی گئی۔ آخر کو اس نے وصیت کی کہ اسے کابل میں دفن کیا جائے۔ مر گیا۔ نعش کابل بھیج دی گئی۔ ہمایوں بادشاہ ہو گیا۔"

"یہ کیسا بادشاہ ہے؟"

"نہایت نیک دل مہربان مگر کمزور۔"

"بابر تو عجیب و غریب انسان تھا۔"

"مگر اسے ہندوستان سے بالکل رغبت نہ تھی۔ دن رات کابل کو یاد کیا کرتا تھا۔"

"سنا ہے باغ لگانے کا بڑا شوق تھا۔"

"خالی وقت باغ لگانے اور عمارت بنوانے میں مصروف رہتا تھا۔ بڑا بہادر آدمی تھا۔ دو آدمی ایک اس بغل میں ایک اس بغل میں دبا کر قلعہ کی فصیل پر ٹہلتا تھا۔"

"مگر ہمایوں میں اس کی کوئی صفت نہیں۔"

"نازوں کا پالا لڑکا۔ کاہل۔ افیم کھاتا ہے۔ عیش و عشرت کی طرف راغب ہے۔ مگر بہت ہی بچہ۔ گجرات کی فتح کی طرف خاص توجہ ہے۔"

بڑا ہو گیا۔ ایک دن خبر آئی کہ کابل کو فتح کرنے میں اس کے گولہ لگا جس سے وہ جل کر مر گیا۔ یہ سب کیا تھا؟ مسلمانوں میں جو کوئی بھی قابل نکلتا تھا وہ لڑتے ہوئے ہی ختم ہو جاتا تھا۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ ہمایوں کی واپسی کی خبر آئی۔ اس نے افغانستان ختم کیا۔ سندھ فتح کیا۔ پنجاب فتح کیا اور دلی کو بھی فتح کر لیا۔ مگر دلی فتح کرنے کے چند دن بعد ہی وہ قلعہ کی دیوار سے گرا اور مر گیا۔ اس کا ایک نو برس کا لڑکا تھا اور ایک وفادار دوست۔ لڑکے کا نام جلال الدین اکبر تھا اور دوست کا بیرم خاں۔ سنا کہ بیرم خاں نے اکبر کو اٹھا کر گھوڑے پر بٹھایا۔ اکبر نے اپنے سپاہیوں سے کہا: "تم میرے ساتھ آؤ یا نہ آؤ میں لڑنے جاتا ہوں"۔ اس بچے کا عزم دیکھ سب اس کے پیچھے ہو لئے۔ ہیمو بقال ایک لاکھ فوج لے کر اس سے لڑنے آیا تھا۔ پھر پانی پت کے میدان پر جنگ ہوئی جسے بابر کے نو برس کے پوتے نے جیتی۔ ہیمو کی آنکھ میں تیر لگا۔ بیرم خاں ہیمو کی مشکیں باندھ کر اکبر کے سامنے لایا اور بولا: "دشمن کو قتل کر کے غازی کا خطاب حاصل کیجئے۔" اکبر نے کہا: "مجبور شخص پر ہاتھ اٹھانا ظلم ہے۔" بڑا منصف مزاج بادشاہ معلوم ہوتا ہے! وہ ابھی کل نو برس کا لڑکا۔

"اصل بادشاہ تو بیرم خاں ہے۔" مشہور ہوا۔ "بادشاہ تو ہاتھی لڑانے، ہرن کا شکار کرنے میں مصروف رہتا ہے۔"

مگر جب بیرم خود مختار سا ہونے لگا تو اس لڑکے نے اسے پکڑ لیا۔ لڑکا بیرم کا استاد نکلا۔ وہ پھر کھیل کود میں پڑ گیا اور اس کی دائی ماہم انگا حکومت کرنے لگی۔ ماہم کا لڑکا ادھم خود سر ہونے لگا۔ اکبر ہاتھی پر سوار آ رہا تھا۔ اس نے اس ادھم کی خبر سنی۔ تلوار نکال کر قلعہ میں داخل ہوا۔ ادھم خاں کو قتل کر دیا اور اس کی نعش کو فصیل پر سے نیچے پھنکوا دیا۔ یہ لڑکا عجیب و غریب تھا۔ کیسا مستعد، کیسا تیز مگر جاہل۔ بالکل جاہل۔ ایک لفظ نہیں پڑھ سکتا۔ مگر یہ حکومت کرنے لگا۔ اس نے حکومت شروع کر دی۔

ایک علامہ شیخ مبارک تھے۔ اپنے دو لڑکوں ابوالفضل اور فیضی کے اس کے ساتھ

بن نقیب ہوا اس کے خلاف ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی ڈر کر جنگلوں میں بھاگ گئے۔ شیخ عبدالقدوس کے پوتے شیخ عبدالنبی کو صدر الصدور مقرر کر دیا۔ یہ شیخ احمد کے بیٹے ہیں۔ […] رہے ہیں۔ ہندو بھگتوں اور پنڈتوں کا بھی اس کے ساتھ مجمع رہتا ہے۔

اب خبر آئی کہ اکبر سنگم جا رہا ہے۔

کیوں؟

ایک منجم نے بتایا کہ وہ پہلے جنم میں برہمن تھا اور سنگم پر گر اس نے اپنے سامان کو دفن کر دیا تھا اور تہ زمین میں بہہ گیا تھا۔ اکبر اس سامان کو کھدوانے کے لئے آ رہا ہے۔ […] پر ایک عظیم الشان جلوس آتا دکھائی دیا۔ ہر قسم کے باجوں کی آواز میں۔ اس کے بعد ایک ہاتھی پر بادشاہ خود سوار تھا۔ شاہ تھا۔ بادشاہ چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ ہے۔ لیکن […] چہرہ بنا ہوا۔ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جلوس سنگم کی لکیر پر ٹھہرایا گیا۔ بادشاہ کا بجرا کنارے لگایا گیا۔ بادشاہ عجب بے پرے کو دکھا۔ مسلم سامنے موجود تھا۔ کورنش بجا لایا۔

"تم مسلم ہو [؟]" بادشاہ نے پوچھا۔

"حضور عالی جاہ گیتی پناہ جل جلالہٗ۔"

زمین کھودی جانے لگی۔ کافی کھودنے کے بعد ایک کاسہ ایک چمٹا اور ایک کفنی نکلی۔ مسلم اسے لیکر بادشاہ کے سامنے آیا۔

"اس سامان کو شہر بھر میں گھما دیا جائے۔"

وہاں جو شہر کے کونے کونے کے لوگ […] بادشاہ کے پچھلے جنم کا سامان دیکھنے آئے […] نے اسے اپنا آدمی مان لیا۔ شہر کا نام الہ آباد رکھ دیا گیا۔ قلعہ کی پھر سے تعمیر شروع ہوئی۔ […] اور بارونق کا جوڑا بہت پسند آیا۔ "تم دونوں میرے ساتھ چلو۔ میرے ساتھ رہو۔ میرے کے پیش رو ہو۔" اکبر نے بڑی محبت کے لہجے میں کہا۔

حصۂ سوم

وظیفہ ات غزل.......

(جمال الدین عرفی شیرازی کی دربار اکبری میں آمد سے میر محمد تقی میر کے لکھنؤ میں آجانے تک۔)

اکبر گجرات کو فتح کر کے آگرہ کے قلعہ میں واپس آیا ہی تھا کہ گجرات میں پھر بغاوت کی خبر آئی۔ اکبر عجب عالم میں آ گیا۔ بجلی کی طرح کود کر گھوڑے پر سوار ہوا اور گجرات کا راستہ لیا۔ اس کی فوج پریشانی کے عالم میں سوائے اس کے پیچھے ہو لینے کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اکبر پر کون سی روح سوار تھی۔ عزم۔ استقلال۔ سب سے زیادہ تیزی۔ وہ انسان نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ مسلم نے محمود غزنوی سے لے کر علاؤالدین تک بہت سپاہی دیکھے تھے۔ مگر یہ کچھ اور ہی چیز تھا۔ بابر شاید ایسا ہی ہوگا۔ مگر نہیں۔ بابر کچھ اور ہی تھا۔ اکبر کے لئے رکنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اس کی روح میں سیماب تھا۔ ہر چوکی پر گھوڑا تیار ملتا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سے اچک کر خالی گھوڑے پر بیٹھ جاتا۔ ایسا سپاہی شاید پہلے کبھی پیدا نہ ہوا تھا۔ اس میں سپاہی کی روح اپنے کمال پر تھی۔ جنگل پہاڑ دریا سب اس کے لئے کوئی حقیقت ہی نہ رکھتے تھے۔ قیامت کا سوار! فوج چور چور تھی۔ مگر اکبر کی روح فوج میں بھی آ گئی تھی۔ فوج نے پڑاؤ بھی ڈالے مگر بادشاہ گھوڑے پر سے نہ اترا۔ گجرات کو پھر فتح کرنے سے پہلے اس کو دم لینا حرام تھا۔ اکثر فوج کچھ پیچھے رہ جاتی۔ مگر اکبر مڑ کر نہ دیکھتا۔ مسلم نے حتی الوسع کوشش کی کہ اکبر کے ساتھ ہی ساتھ رہے۔ وہ ساتھ رہنے کے لئے مجبور تھا۔ وہ سپاہی کا بچہ تھا۔ عرصے سے سپاہ گری بھول چکا تھا۔ مگر اکبر

کی روح نے اسے بھی ویسا ہی سپاہی بنا دیا تھا جیسا کہ وہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ ایک زبردست
مقناطیسی قوت اسے اس حیرت انگیز سپاہی کے پیچھے لگائے تھی۔ ہر قدم ایک معجزہ تھا
اور نہ معلوم ہوا کہ کیسے گیارہ دن گزر گئے۔ آخر کو احمد آباد کا قلعہ دکھائی دیا۔ معلوم ہوا کہ ایک
[illegible] اپنے پیچھے فوج کو دیکھ کر اکبر ہوا میں اڑنے لگا۔ مسلم پیچھے پیچھے جا رہا تھا اور وہ دیکھ رہا
تھا کہ گھوڑے کی ٹاپیں مستقل ایک گز زمین سے اوپر تھیں۔

قلعہ کے دروازے آپ ہی آپ کھل گئے۔ قلعہ کے اندر گھوڑا ساکت کھڑا ہو گیا۔
قلعہ کے مالک نے آکر رکاب پر سر رکھ دیا۔ فتح فتح فتح کی آوازیں بلند ہوئیں۔ کیسے قلعہ
فتح ہوا؟ محض اقبال سے۔ کمال! معجزہ! مسلم نے اکبر کے چہرہ کو دیکھا۔ وہ سورج کی طرح
چمک رہا تھا۔ نہ معلوم کہاں سے یہ شعر فضا میں گونج گیا۔

ز آسمان و زمین مژدہ ناگہاں آمد
کہ آفتاب بزمیں تاج آسماں آمد

اکبر آگرہ واپس چلا۔ راستے میں ریاست بوندی سے گزرا۔ وہاں کے راجہ نے اپنی
لڑکی جودھا بائی کی اس کے ساتھ شادی کی تحریک کی۔ مسلم کو علاؤالدین یاد آیا جو پدمنی
کے لئے لڑا اور اس کو نہ پا سکا۔ اکبر کو پدمنی خود مل رہی تھی۔ بیاہ ہوا۔ اکبر اور جودھا بائی
کے دامن باندھے گئے اور وہ آگ کے چاروں طرف گھومے "بادشاہ ہمیشہ راجپوت ماں
کا لڑکا ہی ہوگا۔" آگرہ پہنچ کر اکبر اپنی رانی کو ساتھ لے کر شاہ سلیم چشتی کے پاس سیکری
پیدل چلا۔ شاہ صاحب نے دونوں کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور فرزند سلیم کے پیدا ہونے کی
پیشین گوئی کی۔ سیکری کا نام فتحپور رکھا گیا اور محلات کی تعمیر شروع ہوگئی۔ اکبر ملک کے انتظامات
میں لگ گیا۔ ٹوڈرمل وزیر مال زمین کی ناپ اور مالگذاری کا تعین کرتا تھا۔ مسلم کو
ہزاری منصب داری ملی۔ اپنے عہدے کے کام سرانجام دینے میں اسے محسوس ہوا کہ وہ پھر سپاہی
ہو گیا تھا۔ مگر اب وہ نئے قسم کا سپاہی تھا۔ بابر کے قسم کا سپاہی جو اپنی لڑائیاں محض جیتنے کے

زور سے نہیں بلکہ عقل کے زور سے جیتتا تھا جس کا کمال اس کے پوتے اکبر میں نمایاں تھا۔
معجزہ کے رنگ میں نمایاں تھا۔ گجرات کی فتح اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتی۔ وہ اور پاروتی
پھر سنگم پر آ گئے تھے۔ یہاں الہ آباد کا قلعہ بن رہا تھا۔ مسلم نے اپنے لئے اس مقام پر جہاں اس
نے پہلے پاروتی کو دیکھا تھا ایک محل بنوایا جس میں باغ ان دونوں نے مل کر خود لگایا۔ محل
کے خاص دالان میں مینا کا کام کرایا۔ دیواروں پر سنہرے حرفوں میں شعر لکھوائے۔ بہزاد
نے اس کی اور پاروتی کی تصویریں بنائیں جو اس کے خاص دالان میں لگا دی گئیں۔ مسلم
اور پاروتی زیادہ تر اس دالان میں بیٹھتے۔ مسلم کی تصویر کو پاروتی دیکھ کر کہتی :-

"اس میں ایک عجیب جادو ہے۔"

"مغل دربار کا لباس عجیب چیز ہے؟" مسلم کہتا۔ اور پھر پاروتی کی تصویر کو دیکھ
کر: "یہ لباس تم پر سب سے زیادہ جچتا ہے۔"

☆ پاروتی دونوں تصویروں کو دیکھ کر کہتی: "لباس ہی نہیں۔ ہمارے اور تمہارے
چہرے بھی بدل گئے ہیں۔ ہماری روحوں میں تبدیلی آگئی ہے۔"

"ہم اور تم صدیوں سے ساتھ ہیں۔ مگر اب آ کر ایک دوسرے سے ایسے ملے ہیں کہ
ایک ہو گئے ہیں۔"

"یہی یہی۔ ہمارے اور تمہارے کپڑے ہی ایک قسم کے نہیں ہو گئے بلکہ صورتیں،
رنگ اور انداز سب کچھ ایک ہو گئے۔ ہم اور تم اب ایک قوم ہیں۔"

اور دونوں ایک دوسرے سے چمٹ کر ناچنے لگتے۔ ناچتے ہوئے دالان سے چبوترے
پر آ جاتے۔ ان دونوں کی زبان پر بالکل ہندوستانی راگ میں یہ شعر رواں تھا۔

نو بہار آمد و بشگفت گل و یاسمنا
باغ ہمچو دمن و راغ بساں عدنا

چبوترے سے یوں ہی گاتے ناچتے روش پر آتے۔ سرو کے درختوں پر عشق پیچاں

Scanned with CamScanner

کی بیل بھی مسلم سرو کا درخت تھا۔ آتما عشق پیچاں کی بیل۔ دونوں حوض کے کنارے ناچتے رہتے۔ اپنے عکس کو حوض کے صاف پانی میں ناچتا دیکھتے رہتے اور آخر میں محو ہو کر حوض میں گر جاتے۔ پانی کی سطح کے نیچے غائب ہو جاتے۔

اکبر کی حکومت عجیب امن عجیب ترقی، عجیب دلچسپی اور عجیب خوشی کا دور تھا۔ ہر طرف ہر قسم کی آزادی کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ اسلامی حکومت میں پہلی دفعہ ہندوؤں نے اپنے تئیں کامل طور پر آزاد محسوس کیا۔ اکبر اکثر ہندوانہ لباس میں درشن دیا کرتا تھا اور ہندو رسم و رواج میں بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ پاروتی بنارس گئی تو اسے معلوم ہوا کہ بابا تلسی داس رام کتھا لکھ رہے ہیں۔ مسلم اور پاروتی دونوں نے جا کر ان کے پاؤں چھوئے۔ انھوں نے رامائن کے کچھ حصے گا کر سنائے۔ پاروتی نے ساری رامائن کی نقل لے لی اور گھر آ کر روز صبح اسے پڑھتی۔ رام اور سیتا کا معنی خیز قصہ اس کی زندگی کے لیے مشعل راہ ہونے لگا۔ مسلم بھی اس کی پیاری آواز میں یہ قصہ سنتا۔ قرآن شریف کا ورد وہ چھوڑ ہی چکا تھا۔ عربی زبان اسے بالکل فراموش ہو چکی تھی۔ تلسی داس کی نرم نازک میٹھی میٹھی زبان کا راگ اس کے دل پر اثر کر رہا تھا۔ رامائن کے اکثر ٹکڑے یاد ہوتے جا رہے تھے۔ وہ ان کو پاروتی سے سن کر وجد میں آ جاتا تھا۔ مگر اکثر اکیلے میں خود بھی پڑھ کر محویت میں ڈوب جاتا۔ اکثر وہ رامائن پر پاروتی سے باتیں کرتا۔

"رزم خیر و شر کا اس سے بہتر نقشہ کہیں نہیں ملتا۔"

"رام اور راون کی جنگ ہمیشہ جاری ہے اور جاری رہے گی۔"

"مگر ہمارے ادب میں اسے یوں نہیں دکھایا گیا۔ اور پھر سیتا کچھ الگ ہی چیز ہے۔"

"نہیں پورے قصے کی جڑ تو وہی ہے سیتا، رام کی تھی مگر راون لے گیا۔"

"پاروتی کہیں تم تو سیتا نہیں ہو۔"

"اگر میں سیتا ہوں تو تم کون ہو؟"

"میں ساون باہر سے آیا تم کو اٹھا لے گیا۔"

"نہیں میرا تم سے پہلے کوئی رام نہ تھا۔ تم ہی میرے رام تھے اور ہاں کوئی راون اگر مجھے بھگا نہ لے جائے۔" اور پاروتی تھرا جاتی۔

مسلم پر بھی خوف طاری ہوتا۔ وہ پاروتی کو چمٹا کر کہتا۔ "اگر کوئی راون میری سیتا کو لے جائے گا تو میں بھی اس سے لڑوں گا اور اسے چھڑا لاؤں گا۔"

"مگر تم پھر مجھ کو اگن پاس کرو گے۔"

"نہیں یہ مجھے پسند نہیں ہے۔ رام نے یہ کیوں کیا، یہ مجھے ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔"

اور مسلم دوڑ کر مولانا روم کی مثنوی اٹھا لاتا۔ اس میں گڈریا اور موسیٰ کا قصہ سناتا اور پھر وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا کے بعد کے اشعار دونوں ساتھ پڑھتے۔ دونوں اتفاق کرتے کہ نام میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ اللہ اور پرماتما ایک ہی ہیں۔ "پرم آتما" مسلم کہتا۔ "یہ لفظ مجھے اللہ سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

"اللہ کے کوئی معنی نہیں۔" پاروتی کہتی۔

"ہاں میری آتما اور اس کے اوپر پرم آتما" کہہ کر مسلم عجیب محویت میں آ جاتا۔

اور ایک دن پھر وہ دونوں فتح پور سیکری پہنچے۔

اکبر کا شاندار دربار لگا ہوا تھا۔ اکبر خود ایک سونے کے تخت پر بیٹھا تھا۔ تاج میں ہیرا چمک رہا تھا مگر ہیرے سے زیادہ اکبر خود کا چہرہ دمک رہا تھا۔ نورتن قریب تخت پر بیٹھے تھے۔ باقی تمام منصب دار قطار باندھے باادب کھڑے تھے۔ ملک الشعرا فیضی نے اپنے تخت سے اٹھ کر بادشاہ کے تخت کو بوسہ دیا اور کہا "گیتی خداوند۔ ایک شاعر ارض شیراز سے رشک حافظ و سعدی قدم بوسی کے لیے حاضر ہے۔ شرف قدم بوسی چاہتا ہے۔"

"حاضر ہو" اکبر نے حکم دیا۔

منصب داروں کی قطار کے درمیان ایک جوان حسین ایرانی کمر جھکائے ہوئے

آگے بڑھتا ہوا تخت شاہی تک آیا اور تخت کو چوم کر دست بستہ کھڑا ہو گیا۔
" اپنا کلام سناؤ۔ بدولت تمہارا کلام سنیں گے۔"
شاعر پیچھے ہٹتا ہوا دس قدم پر کھڑا ہوا۔ اور پھر بولا۔ " مسلک ایں فقیر بایں شعرا دامی شود

قصیدہ نظم ہوس پیشہ گان بود عرفی
تو از قبیلۂ عشقے وظیفہ ات غزل است

ولے ایں فقیر قصیدہ می گوید در مدح کبریا و رسالتمآب و امیر المومنین علیہم السلام حالا چند اشعار در مدح کبریا پیش می شود۔"
شاعر نے مطلع پڑھا۔ عجیب لہجہ تھا۔ عجیب زور۔ عجیب جوش۔

اے متاع درد در بازار جاں انداختہ
گوہر ہر سود در جیب زیاں انداختہ

بادشاہ جھومنے لگا۔ کئی بار اس شعر کو پڑھنے کا حکم دیا۔ وہ اشعار پڑھتا گیا بادشاہ جھومتا رہا۔ پھر اس شعر پر آیا۔

در چمنہائے محبت ہر قدم چوں کربلا
از نسیم عشوہ فرش ارغواں انداختہ

اس پر بادشاہ تخت سے کچھ اٹھ کر تعریف کرنے لگا۔ تمام دربار سکوت کے عالم میں آگیا۔ پھر بادشاہ کو یہ شعر بہت پسند آیا۔

کردہ از عرفاں لباس عجز را دامن دراز
کوتہی در جیب عقل نکتہ داں انداختہ

مگر جس شعر نے بادشاہ کو تڑپا دیا وہ یہ تھا:

من کہ باشم عقل کل را نا رک انداز ادب
مرغ اوصاف تو از اوج ہماں انداختہ

" دانش از جواہرات پر کنند۔" بادشاہ نے حکم دیا۔ خدام جواہرات کی کشتی لے آگے بڑھے۔ شاعر نے مقطع پڑھا۔

مست ذوق عرفیم کز نغمۂ توحید تو
لذت آوازہ در کام جہاں انداختہ

بادشاہ کو یہ مقطع بھی بہت پسند آیا۔ فیضی نے اٹھ کر بادشاہ کا تخت چوما۔ اور کہا " گیتی پناہا ایں شاعر بے نظیر جمال الدین عرفی شیرازی نو وارد است و بر مکان حکیم ابوالفتح حاضر است۔"
عرفی کو خلعت فاخرہ پہنایا گیا جواہرات کی کشتی اس کے ہاتھ میں دی گئی۔ اس نے قریب آ کر بادشاہ کے تخت کو بوسہ دیا۔ حکم ہوا کہ بادشاہ کے مہمانوں میں جگہ دی جائے۔ دربار برخواست ہوا مسلم فیضی کے پاس گیا۔ فیضی نے اس کا تعارف عرفی سے کرایا۔ عرفی نے اپنا شعر پڑھا ۔

من از فریب امارت گداشدم ورنہ
ہزار گنج بویرانۂ دل افتادہ ست

مسلم نے عرفی کو غور سے دیکھا اور کہا " شہنشاہ اکبر کی حکومت اور آپ کی شاعری ایک نئے دور کا آغاز ہیں۔" فیضی کو یہ تعریف اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ مسلم اور عرفی دوست ہو گئے۔ دونوں ایک ہی جگہ مقیم رہے۔
مہارانی جودھا بائی کے محل میں آمارو تی تخت کے پاس زمین پر بیٹھی تھی۔ جوان شاہزادہ سلیم دوڑتا ہوا آیا اور بولا " ماما شیراز سے کبوتر آئے۔ کبوتر بہت نفیس جوڑا ما!"
جودھا بائی کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا۔ اس نے سلیم کو گلے سے لگایا اور منہ پر چٹ چٹ پیار کئے۔ سلیم جانے لگا۔ مہارانی نے اشارہ کیا۔ آمارو تی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ محل دربار کی جشن وانداز و رنگ پائے جاتے ہیں۔ عجیب چیز سلیم ہو رہی تھی جب یہ

پنجرہ کھول کر اسے دیکھتا اور ٹہلتا ہوا محل کے سامنے والے باغیچے میں آیا۔ نہروں میں فوارے چل رہے تھے۔ قسم قسم کے کبوتر ادھر اُدھر پھر رہے تھے کچھ حوض میں پانی پی رہے تھے۔ کچھ اڑ رہے تھے۔ سلیم ٹہلتا ہوا ایک ہم سن لڑکی کے پاس پہنچا جس کے سر کا دوپٹہ ڈھلکا ہوا تھا اور سینہ کا ابھار نمایاں تھا۔ یہ لڑکی مٹھی میں ایک کبوتر کے پنجے پکڑے کھڑی تھی۔ کبوتر پر پھڑپھڑا رہا تھا۔

"دوسرا کیا ہوا؟" سلیم نے پاس جا کر پوچھا۔

لڑکی نے اپنی مٹھی سے کبوتر کو چھوڑتے ہوئے کہا "اس طرح اڑ گیا۔"

لڑکی کے چہرہ پر عجیب معصومیت تھی۔ سلیم بجائے غصہ ہونے کے اس کے چمٹ گیا اور اس کے لبوں کو چومنے لگا۔

پاروتی مہارانی کے پاس آئی۔ مہارانی خود اٹھ کر باہر آئی اور دیکھا کہ اس کا شہزادہ کنیز مہرالنسا سے چمٹا ایک پیڑ کے نیچے کھڑا ہے۔ یہ آگے بڑھ کر پاس پہنچی۔ دونوں چونک کر الگ ہو گئے۔ سلیم ماں سے چمٹ گیا۔ مہرالنسا مہارانی کے چرنوں پر گر گئی۔

"با ادب۔ با ملاحظہ ہوشیار" کی آواز ڈیوڑھی پر سے آئی۔ شہنشاہ محل سرا میں تشریف لا رہا تھا۔ جودھا بائی نے مہرالنسا سے کہا: "جا بھاگ اپنی ماں کے پاس" اور سلیم کو ساتھ لئے ہوئے آ کر اپنے تخت پر بیٹھ گئی۔ شہنشاہ عرفی کا یہ شعر پڑھتا ہوا قریب آیا۔

کسے کہ محرم باد صبا ست می داند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقیست

ملکہ نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ دونوں تخت پر بیٹھے۔ پاروتی تخت کے پیچھے چنور ہلانے لگی۔

"شیخو بابا" اکبر نے کہا "فیضی کہتے تھے کہ تم دل نہیں لگاتے ہو۔ شیراز کا ایک شاعر عرفی آیا ہے۔ خواب میں تم کو دیکھ کر یہاں تک چلا آیا۔ بڑا شاعر ہے۔ قصیدہ خوب کہتا

مگر تمہارے لئے قصیدہ کہہ رہا ہے۔"

"قبلۂ عالم میں استاد کے یہاں اس سے مل چکا ہوں۔ میں ایک دن اس کا قصیدہ سنوں گا۔"

"اچھا تو تم اب جاؤ۔"

شہزادہ چلا گیا۔ ملکہ نے مہرالنسا کا واقعہ سنایا۔ شہنشاہ متفکر ہو۔ "مہرالنسا کا میں شیر افگن سے آج ہی نکاح کرائے دیتا ہوں۔"

"اور میرے بچے کی شادی میری اجودھیا بائی سے اب کر ہی دینا چاہیے۔"

"اجمیر شریف کے عرس کا زمانہ آ ہی گیا ہے۔ بدولت بیگا تیرتھ شادی کرتے ہوئے چلیں گے۔"

دوسرے دن تمام امراء اور فوج شہنشاہ کے ہمراہ پاپیادہ چل کھڑی ہوئی۔ بیگا تیرتھ میں سلیم کی شادی جودھیا بائی سے بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ بھونری کی رسم بالکل ویسے ہی ہوئی جیسی اکبر خود کی شادی میں ہوئی تھی مگر ڈولہ رخصت ہوتے وقت ایک اور خاص رسم ادا ہوئی جو مسلم کے لئے بڑی ہی عجیب تھی۔ جب دولہن ڈولے میں بیٹھ گئی تو ڈولا اٹھانے کے لئے پہلے سسرے کا آنا ضروری تھا۔ بسر اکبر شہنشاہ اکبر اس سے ڈولا اٹھانے کو کون کہتا۔ تھوڑی دیر سکوت رہا۔ اکبر خود سمجھ گیا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ ڈولے کے پاس جا کر آگے کا ڈنڈا اپنے کاندھے پر اٹھا لیا۔ پیچھے کے ڈنڈے کو مسلم نے اپنے کاندھے پر جما لیا۔ اکبر کا ایک قدم آگے بڑھا راجپوت سردار ڈھولک بجا کر گانے لگے۔

ہماری لڑکی تمہارے گھر کی لونڈی ہم بھانڈ خدام ہے

اکبر کو بھی جواب میں کچھ کہنا تھا۔ اس نے جواب دیا

تمہاری لڑکی ہمارے محلوں کی رانی تم راج سردار ہے

تمام راجپوت پھڑک گئے۔ راجپوت یہ بول گاتے ہوئے اور اکبر یہی جواب دیتا ہو

[illegible] ہوئی۔ اجمیر میں دو
دولہن کو خواجہ صاحب کے مزار کے گرد پھرایا گیا۔ ڈھائی دن کے جھونپڑے کے چاروں طرف خیمے پڑ گئے کئی دن کے بعد سب واپس ہوئے۔ سیکری پہنچ کر پہلے شاہ سلیم چشتی کی تربت میں سلیم اور جودھا بائی کو حاضر کیا گیا۔ انھوں نے صیغۂ نکاح پڑھا اور سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانے ہو لیے۔

مسلم آتے ہی عرفی سے ملا جو ساتھ نہیں گیا تھا۔ دونوں ابوالفضل کے گھر پہنچے۔ ابوالفضل منہ میں قلم دبائے بیٹھا تھا۔ کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں حضور؟" مسلم نے دریافت کیا۔

"میں بے نقطہ تاریخ لکھ رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ والدہ کا نام کیسے لاؤں؟"

"ممارک کیوں نہیں لکھتے" عرفی نے طنزیہ لہجہ میں کہا "ہندوستان کے دیہاتی مبارک کو ممارک ہی کہتے ہیں۔"

ابوالفضل نے غور سے عرفی کو دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں۔ عرفی نے قہقہہ لگایا۔ دونوں وہاں سے سلیم کے دربار میں آئے۔ یہاں شراب کا دور چل رہا تھا۔ مسلم نے عرض کی "شاہزادے بلند اقبال! عرفی نے حضور کی شان میں قصیدہ کہا ہے۔"

"پیش ہو" شہزادے نے کہا۔

عرفی نے مسودہ نکالا۔ اور شروع کیا۔

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم — گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

وہ شعر کے بعد شعر پڑھتا رہا اور محفل جھومتی رہی۔ عرفی سلیم پر عاشق تھا اور جس حصے میں اس نے سلیم کے اُسے بلانے کا حال بیان کیا ہے وہ بہت ہی پسند کیا گیا [illegible] دہے ہے

چہ لذت گفت کہ اے مخزن جواہر قدس — چہ نعمت گفت کہ اے مقصد بہشت نعیم

بیا کہ از غربت یاد می کنند دریا — بیا کہ تشنہ لبت را طلب کند تسنیم
بہ رہ فتادم و گشتم چناں شتاب زدہ — کہ دست اہل کرم در نثار گوہر و سیم

سلیم کو یہ قصیدہ بہت پسند آیا۔ اس نے عرفی کو گرانقدر انعام دیا۔ مسلم اور عرفی دربار سے باہر آئے۔ مسلم نے کہا "میں راجہ بیربل کے پاس جانا چاہتا ہوں۔"

"میں نہ جاؤں گا" عرفی نے کہا اور پھر اپنا یہ شعر پڑھا:

منہ عناں تعلق بدست ہر ذرّہ
بیار دستے و ہم دوش آفتاب انداز

مسلم راجہ بیربل کے محل میں آیا۔ وہ کہیں جانے کو تیار تھے بولے "بھئی مسلم تم خوب آئے۔ حضرت ظل اللہ گیتی پناہ سے ایک بحث ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ تم بھی دیکھ لو تو اچھا ہو۔"

"کیا بحث؟ راجہ جی آپ کی اور گیتی پناہ کی روز ہی چلتی رہتی ہے۔"

"اچھا مسلم ایک بات بتاؤ۔ تم تو بہت سے پیر فقیر بھگت دیکھ چکے ہو یہاں ایک گدھا پیر مشہور ہیں ان کی کرامت کے سلسلے میں کیا کہتے ہو۔"

"شہر بھر میں ان کی کرامت کا چرچا ہے۔ میری بیوی مہارانی کے ساتھ کئی دن ہوئے گدھا پیر کے مزار پر گئی تھیں۔ مہارانی نے گیتی پناہ سے ذکر کیا۔ انھوں نے حکم فرمایا کہ مزار پر ایک گنبد بنوایا جائے اور خود تشریف لے جائیں گے۔"

"ہاں بھائی میرے سامنے حکم دینے ہی والے تھے کہ میں نے روک دیا۔" یہ کہہ کر بیربل ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے مسلم ان کا منہ تکتا رہا۔ پھر بولے "آؤ چلو گیتی پناہ بھی تشریف لے جائیں گے مگر معمولی لباس میں۔ راجپوت سپاہی کے لباس میں چلو۔"

دونوں آکر گھوڑے پر سوار ہوئے شاہی محل کے عقب دروازے پر آ گئے یہاں اندر سے ایک معمولی راجپوت سپاہی معمولی گھوڑے پر سوار آیا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ تینوں گدھا پیر کے مزار پر پہنچے۔ مزار کے چاروں طرف قناتیں گھری ہوئی تھی۔ صرف ایک طرف

Scanned with CamScanner

راستہ تھا جس پر ایک مسلح سپاہی کھڑا تھا۔ تینوں قنات کے اندر گئے۔ یہاں دو آدمی پھاوڑے لیے ہوئے نظر آئے۔ اکبر نے پوچھا: "یہ کون ہیں۔"

"عالی جاہ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔" بیربل نے کہا اور مزدوروں کی طرف مڑ کر کہا: "اس قبر کو کھود دو۔"

"آئیں؟ قبر کا کھودنا جرم ہے اور پھر ایک پیر کی۔" بادشاہ کے چہرہ پر شکن آگئی۔

"حضور کو یہ دکھانا ہے کہ یہ قبر ہے کس چیز کی۔" بیربل نے کہا۔ اور مزدوروں کو پھر حکم دیا۔ وہ لوگ کام میں مصروف ہوگئے کچھ ہی دیر میں قبر کھد گئی۔ قریب جاکر بیربل نے بادشاہ کو دکھایا اس میں ایک گدھے کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ مزدوروں نے اسے اٹھا کر بلند کیا۔

"گدھے کا ڈھانچہ۔ گدھے کی قبر!" بادشاہ نے کہا۔

"گیتی پناہ اس غلام نے یہاں ایک مرا ہوا گدھا پڑا دیکھا تھا اس کو دفن کروا دیا۔ قبر بنوا دی۔ گدھا پیر مشہور کروا دیا۔ اب حضور تک خبر پہنچی تو میں نے مناسب سمجھا کہ آپ پر راز افشا ہو جائے۔"

"مگر یہ سب تم نے کیوں کیا؟"

"حضور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ پیر بڑا نہیں ہوتا اعتقاد بڑا ہوتا ہے۔"

اکبر سوچ میں پڑ گیا۔

"قبر کو پاٹ دو۔" بیربل نے کہا "اور گنبد کی بنیادیں بھی رکھوا دی جائیں۔ گدھا پیر کے ماننے والوں کا اعتقاد نہ ٹوٹنے پائے۔"

تینوں محل شاہی واپس آ گئے۔

عرفی شہزادہ سلیم کے ساتھ کشمیر چلا گیا۔ وہاں اس نے کشمیر پر ایک قصیدہ لکھا۔ اس کا مسودہ مسلم کے پاس آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد سلیم لاہور آ گئے۔ وہاں سے خبر آئی کہ حسین

ہندو لڑکی انار کلی جس کے ساتھ سلیم نے شہنشاہ سے چھپا کر نکاح کر لیا تھا۔ کچھ بیماری بڑھنے میں مر گئی۔ سلیم بہت افسردہ واپس آیا۔ مگر عرفی اس کے ساتھ نہ تھا۔ مسلم نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ لاہور میں کسی سے لڑ پڑا اور مارا گیا۔ پھر جب اکبر لاہور گیا تو مسلم نے لوگوں سے عرفی کی قبر کا پتہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ ایک صاحب اس کی نعش کو قبر میں سے نکال کر نجف لے گئے۔ مسلم کو عرفی کا شعر یاد آیا ؎

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار

جوان مر گیا۔ حافظ اور سعدی شیرازی سے آگے بڑھ جاتا اگر زندہ رہتا۔ ویسے ہی جیسے کہ اکبر تمام بادشاہوں سے آگے بڑھ گیا ہے وہ شاعر ہی نہ تھا بلکہ فلسفی بھی تھا۔ زبردست فلسفی اور اکبر بھی بادشاہ ہی نہیں بلکہ زبردست فلسفی بھی ہے۔

وہ یوں ہی سوچ رہا تھا کہ شیخ مبارک کے فتوے کی خبر اس کے کان میں آئی قرآن و احادیث سے یہ ثابت کیا گیا کہ اکبر شہنشاہ ہی نہیں بلکہ خلیفۃ المسلمین بھی ہے۔ اکبر آگرہ پہنچا۔ جمعہ کی نماز جامع مسجد میں اس نے خود پڑھائی اور پھر خطبہ پڑھا۔ شہر بھر میں شور مچا۔ علماء نے اکبر کی خلافت سے انکار کیا۔ سب کو جمنا پار کرنے کا حکم ہوا۔ سب کی ناویں ڈوب گئیں اور وہ مر گئے۔ عبدالقادر بدایونی اپنا فتویٰ اکبر کے خلاف دے کر جنگلوں میں بھاگ گیا۔

آگرہ میں مسلم کی ایک دن ملاقات ایک اور شاعر سے ہوئی جس کا نام نظیری تھا اور جو نیشا پور سے آیا تھا۔ عرفی کا معتقد تھا۔ نہایت منکسر المزاج نیک سیدھا سادہ آدمی۔ اس نے اپنی غزل سنائی جس کا مطلع تھا ؎

راز دیرینہ زرخ پردہ برانداخت دریغ
کار ما شہرہ ز انشائے غزل ساخت دریغ

مسلم اس کے نرم راگ اور درد میں گم ہو گیا۔

ایک دن اسے اکبر کے عبادت خانے میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ دنیا کے تمام مذاہب کے لوگ موجود تھے۔ بدھ، برہمن، جینی، کو بلایا گیا تھا۔ پارسی، عیسائی، مسلمان، سب ہی مذاہب کے نمائندے موجود تھے۔ سب نے جان توڑ توڑ کر بحث کی۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ اکبر اس کے مذہب پر آ جائے۔ شیخ مبارک سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ انہوں نے آخر میں دین الٰہی کی تجویز پیش کی جس پر سب خاموش ہو گئے۔ دین الٰہی کے ماننے والوں میں شیخ مبارک، ان کے دونوں لڑکے، راجہ بیربل ہوئے۔ مسلم نے بھی اس دین کو قبول کیا۔

اکبر نے صوبوں کی ترتیب دی۔ الٰہ آباد کا صوبہ بنایا اور اس کا صوبہ دار مع پنج ہزاری منصب کے مسلم کو بنایا۔ شہنشاہ خود جمنا کے راستے سے الٰہ آباد آیا اور قلعہ میں جو نئے سرے سے تعمیر ہوا تھا ٹھہرا۔ ہرن کے شکار کے لئے گیا۔ شہر میں جلوس نکلا۔ اکبر دارالخلافہ واپس ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد خبر آئی کہ اکبر عیسائی ہو گیا۔ عیسائی پادری اس کے ساتھ رہتے تھے اور شہزادے مراد کو ایک عیسائی کی تربیت میں دے دیا گیا تھا۔ مسلم نے اس خبر کو سنا اور وہ آما سے اس معاملے میں بات چیت کرنے لگا۔

"اکبر اگر عیسائی ہو جائے گا تو سب مذاہب کو چھوڑ دینا پڑے گا۔"

"شہنشاہ ہرگز عیسائی نہ ہوگا۔ وہ سب مذاہب کا مطالعہ کر چکا ہے۔ ہر مذہب کے بہترین اصول لے چکا ہے۔ یہ عیسائی اس پر کچھ اثر نہیں کر سکتے۔"

"تو وہ سب کو اُلّو بناتا ہے۔"

"نہیں۔ وہ ان سب سے بالاتر ہے۔ اس کو سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔"

"تم کو اس کی طرف سے حسنِ ظن ہے۔ آخر علاؤالدین نے اس سے زیادہ ملک فتح کیا اور انتظام میں شیر شاہ اس سے آگے تھا۔"

"علاؤالدین اور اکبر میں زمین آسمان کا فرق ہے اور شیر شاہ تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"کیا فرق ہے؟"

"یہی فرق ہے کہ ہم تم اکبر کے بابت سوچ رہے ہیں، علاؤالدین کے بابت کبھی نہیں سوچا۔"

"یہ تو تم نے ایک مبہم بات کہہ دی۔"

"مطلب یہ ہے کہ اکبر کی ہستی ہمیں دعوتِ فکر دیتی ہے۔ ایسے گوناگوں کمالات کا مالک کوئی اور مسلمان اب تک ہوا ہی نہیں۔"

"وہ صرف تین پشتوں سے ہندوستانی ہے۔"

"اور پھر بھی مکمل ہندوستانی ہے۔ بابر کی بہادری اور سپاہی گیری اس میں ہے، شیر شاہ کی انتظامی قوت ہے۔ وہ صوفی بھی ہے۔ صوفیوں میں عقیدہ ہی نہیں رکھتا بلکہ خود بھی سب سے الگ ہو کر فکر میں غرق ہو جاتا ہے اور سب سے بڑی بات جو کسی صوفی میں نہ دیکھی وہ یہ ہے کہ اُسے تمام مذاہب کی تحقیق کا شوق ہے۔ ہر مذہب کے بہترین عالم اس کے یہاں جمع ہوئے۔ ہر ایک کو اس نے مانا۔ ہر ایک نے سمجھا کہ اس کا مذہب قبول کرنے والا ہے۔ مگر وہ ہر ایک سے بالاتر نکل گیا۔ اس کے اندر کبیر اور نانک بھی چھپے بیٹھے ہیں۔ ہر طرف کمال ہی نظر آتا ہے۔"

اس وقت آما کی کالی کالی بڑی بڑی آنکھیں عجیب انداز سے فکر میں آ گئیں۔ مسلم نے انہیں غور سے دیکھا۔ اسے عجیب کیف محسوس ہوا اور وہ کہنے لگا۔ "آما تمہاری آنکھوں کا انداز بھی اکبر کے دور کی خبر دے رہا ہے، کیا سوچ رہی ہو؟"

"مجھے محلات کی تصویریں یاد آ رہی ہیں۔ عبدالصمد کی بنائی ہوئی تصویریں اور اس کے لڑکے دارا کا کی کیا قلم ہے۔ کیا رنگ ہیں۔ اکبر ہرن کے پیچھے دوڑتا ہوا...... اور سونے کے گہنے اور قالین اور پردے۔ اور خوبصورت محلات۔ ہندوستان کو اکبر نے دولہن بنا دیا ہے۔ ایسا کبھی پہلے نہ ہوا۔"

سے دارالخلافہ کو اٹھا لیا۔ پورے خوبصورت شہر کو ترک کر دیا۔

محلات میں راما کا ایسا دل لگتا کہ وہ سب کچھ بھول جاتی۔ بیگمات کے زرق برق لباس ان کا حسن اور سنگھار انھیں دستکاری کے اعلیٰ ترین نمونے بنائے ہوئے تھے۔ باغوں میں زیادہ تر دو دیوان یا کرسیوں پر بیٹھنا۔ پھول کے رستے، نہریں اور فوارے۔ تصویر کتابیں اور بیگمات کے اعلیٰ مذاق انہیں اس عجیب چیز میں گم کر دیتے جس کو مسلم نے تہذیب کا نام دیا تھا۔ اکبر کے محل کی بیگمات سب پڑھی لکھی تھیں۔

اکثر رات میں شہنشاہ خود محل میں آ کر تخت پر بیٹھتا۔ قریب تختوں پر بیگمات بیٹھتیں۔ جھاڑ و فانوس روشن ہوتے۔ کوئی حسین رقاصہ آ کر گاتا اور ناچ کی محفل گرم کرتی۔ فیضی کی غزلیں گاتی۔ ایک رات سلیم بھی ایک تخت پر بیٹھا تھا۔ ایک حسین اور جوان ایرانی لڑکی نے بڑے انداز میں اس کی طرف اشارے کر کر کے یہ غزل گائی۔

اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستۂ — در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستۂ
آرام کردہ در نہاں خانۂ دلم — خلقے دریں گمان کہ بہ محفل نشستۂ
من خوں گرفتہ ہم امروز ورنہ تو — خنجر بدست و تیغ حمائل نشستۂ
خوباں شکستہ رنگ خجل ایستادہ اند — ہرجا تو آفتاب تجمل نشستۂ

وہ لڑکی گلاب کی کلی کی طرح ناچ ناچ کر یہ گا رہی تھی۔ فانوسوں کی روشنی جگمگانی۔ راگ کی مست فضا اور لڑکی کے نازک حسن نے سلیم کو جو بے طرح نشے میں تھا ایسا مست کیا کہ اس نے اٹھ کر لڑکی کو دبوچ لیا۔ بادشاہ کھڑا ہو گیا۔ جلال سے کانپنے لگا۔ سلیم لڑکی کو اٹھائے ہوئے محفل سے بھاگ گیا۔ محفل برخواست ہو گئی۔ بادشاہ آرام گاہ میں چلا گیا۔

مسلم اور راما واپس آئے۔ اکبر دکن کو فتح کرنے میں مصروف رہا۔ خبریں آتی رہیں کہ شہنشاہ اور شاہزادے میں نا چاقی ہے۔ مہرالنساء کے واقعہ سے ہی سلیم کو اپنے والد سے

اور تانسین کے گانے۔"

"ہاں دیپک راگ۔ کیا قیامت تھا۔ چراغ کیسے جل اٹھے تھے۔ معجزہ اسے کہتے ہیں۔ کیا میں دیپک راگ نہیں گا سکتی۔ کاش میں بھی دیپک راگ گاتی۔"

"کیوں نہیں گا سکتیں۔ تم دیپک راگ گاؤ۔"

"ہاں ضرور مشق کروں گی۔"

"تو سمجھو کہ اکبر نے کیا کیا ہے۔ ایک نئی چیز کا وہ بانی ہے جس کو تہذیب کہنا چاہیئے۔ اس میں مذہب، علم، فن ہر چیز آ جاتی ہے۔ اکبر بادشاہ نہیں بلکہ تہذیب کا پیغمبر ہے۔ راما، یہ تہذیب ہی ہماری اور تمھاری روح کو ایک کر دیگی۔ ہندوستان کی تمام قوموں کو ایک تار میں باندھ دیگی۔ ہندوستان کو ایک نیا جنم دے گی۔"

اسی طرح وہ زیادہ تر باتیں کرتے۔ اکبر کے سندھ فتح کرنے کی، کابل میں قبضہ جمانے کی اور دکن پر فوج کشی کی خبریں آتی رہیں۔ پارسی، مہرجی رانا، فرنگی منسورت اور ہندو ویدی سے اختلاط کے حالات معلوم ہوتے رہتے۔ اکثر دونوں فتح پور سیکری پہنچتے اور کچھ عرصہ ان سب چیزوں کے درمیان گزارتے جو تہذیب کی بنیاد تھیں۔ مسلم دیکھتا کہ اکبر کس قدر مصروف انسان تھا۔ دربار روز لگاتا۔ احکام جاری کرتا۔ ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتا۔ خود ہاتھی پر بیٹھ جاتا اور ہاتھی کو کسی فیل بان سے زیادہ قابو میں لانے کا اپنے کو اہل ثابت کرتا۔ شکار پر جاتا۔ ہرن کے پیچھے دوڑتا۔ اور کمان سے ہرن کو پکڑتا۔ کیا تیزی تھی۔ قیامت کا آدمی تھا۔ کاریگروں کو دیکھنے جاتا۔ نقیب آواز لگاتا: "تعظیم کار گزار معاف"۔ سنگتراشوں کا کام دیکھتے دیکھتے ان کے پاس بیٹھ جاتا اور خود کام کرنے لگتا۔ کتنی جلدی ہر کام کو سیکھ لیتا۔ مگر پڑھنا لکھنا نہ سیکھ سکا۔ ہمیشہ سے — نفرت تھی مگر پھر بھی اس سے بڑا عالم کوئی نہ تھا۔ ہر کتاب پڑھوا کر سنتا اور بہت حصہ اس کے حافظہ میں ضم ہو جاتا۔ سلیم چشتی سے عقیدت کا عجیب حال تھا۔ ان کے کہنے پر ایک دن فتح پور سیکری

نفرت ہوگئی تھی۔ وہ اپنے غم کو شراب پی پی کر غلط کیا کرتا تھا۔ مگر اب وہ مہرالنساء کے لئے اور بھی زیادہ بیتاب ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا عشق اتنا گہرا تھا کہ اتنا عرصہ اس کو ختم نہ کر سکا۔ بلکہ وقت کے ساتھ اور تجربات کے باوجود وہ گہرے سے گہرا ہوتا چلا گیا تھا۔

اکبر دکن فتح کرنے میں مصروف تھا کہ سلیم فوج کے ساتھ الہ آباد پہنچا۔ قلعہ پر اس نے قبضہ کیا اور بادشاہ کا خطاب اختیار کیا۔ اپنے نام کا سکہ چلوایا۔ مسلم اور ماما قلعہ چھوڑ کر الگ ہو گئے اور اپنے محل میں آ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں۔ شہنشاہ کے حکم کے منتظر ہیں۔ اکبر دکن سے آگرہ واپس آیا۔ مسلم نے اس کے پاس پہنچ کر سارا حال بیان کیا۔ سلیم تیس ہزار فوج لے کر آگرہ پر چڑھائی کی غرض سے چلا۔ اکبر نے مسلم کو بات چیت کے لئے بھیجا۔ سلیم الہ آباد واپس آ گیا۔ ابوالفضل اس وقت دکن ہی میں تھا۔ اکبر نے مسلم کو اس کے پاس روانہ کیا۔ ابوالفضل نے سلیم کو قابو میں لے آنے کا وعدہ کیا۔ ابوالفضل کے ساتھ مسلم آگرہ واپس چلا۔ راستے میں بیر سنگھ بندیلہ نے حملہ کیا۔ کچھ ہی دیر جنگ کے بعد بیر سنگھ خود نے ابوالفضل کا سر کاٹ لیا اور سلیم کے پاس روانہ کر دیا۔ مسلم نے آگرہ آ کر سارا واقعہ اکبر سے بیان کیا۔ بیر سنگھ کی تلاش میں فوج بھیجی گئی تھی۔ مگر وہ گوالیار میں غائب ہو گیا۔

آگرہ میں خبر مشہور ہو گئی کہ اکبر خسرو کو اپنا جانشین بنانا چاہتا ہے مگر عبدالرحیم خان خاناں کی ماں سلیمہ بیگم کے ساتھ ماما الہ آباد آئی۔ بیگم نے سلیم کو راضی کر لیا۔ سلیم بیش بہا تحائف لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اپنی پگڑی اتار کر سلیم کے سر پر رکھ دی۔ سلیم اب فتحپور سیکری میں رہنے لگا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد پھر الہ آباد آ گیا اور اپنی شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔

اب ماما اکبر کی والدہ حمیدہ بیگم کے ساتھ الہ آباد پہنچی۔ حمیدہ بیگم اپنے پوتے کو بہت زیادہ چاہتی تھیں۔ وہ آگرہ واپس آئیں اور اکبر سے بات چیت کی۔ اکبر نے اپنا دل سخت کر لیا تھا۔ حمیدہ بیگم کو بڑا صدمہ ہوا۔ وہ بیمار پڑی۔ ماما اس کی تیمارداروں میں تھی۔ مگر وہ انتقال کر گئی۔ اکبر نے ہندوؤں کی طرح اپنا سر منڈوایا اور گریہ بیٹھا۔ اس وقت شہزادے دانیال کے مرنے

کی خبر آئی۔ اکبر کا اب دل ٹوٹ گیا۔ عظیم شہنشاہ اب صاحب فراش ہو گیا۔ سلیم کو بھی اب شرم آئی اور وہ آ کر اپنے باپ کے پیروں پہ گر پڑا۔

مسلم اب اکبر کے مختصر ساتھیوں میں ہو گیا۔ شہنشاہ بہت بیمار تھا۔ پادری زاویئر اور اس کے ساتھی اکبر کو دیکھنے آئے۔ اکبر رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔ شہزادے سلیم کو اس نے طلب کیا۔ مرتے وقت بھی اکبر شاندار ہی رہا۔ اس نے سلیم کو تاج پہننے کا حکم دیا۔ پھر ہمایوں کی تلوار باندھنے کا حکم دیا۔ پھر جھروکے میں سے درشن دے کر یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ اکبر نے جہانگیر کو اپنا تخت و تاج دے دیا۔ جہانگیر جھروکے پر آیا۔ باہر سے مبارکباد کا شور سنائی دیا۔ مرتے ہوئے شہنشاہ کے چہرے پر اطمینان نمایاں ہوا۔ مسلم نے قریب بڑھ کر دیکھا کہ شہنشاہ کی سانس رک گئی۔ وہ لڑکھڑایا۔ اسے محسوس ہوا کہ پوری کائنات ایک چکر میں آ کر ڈھیر ہو گئی۔

قلعہ کی دیوار توڑی گئی اور اکبر کے جنازے کو آگے جہانگیر کندھا دیتا ہوا باہر لایا۔ سکندرے تک سلیم خود پیدل ساتھ گیا اور اس شاندار مقبرے میں جو اکبر نے اپنے اور اپنے خاندان والوں کے لئے بنوایا تھا۔ اس عظیم ہستی کے جسم کو دفن کر دیا گیا۔

جہانگیر نے رعیت کے لئے پہلا اعلان یہ کیا کہ اکبر کے دور کے تمام قانون جاری رہیں گے۔ رعیت اور امراء بہت خوش ہوئے۔ مسلم الگ ہی الگ تھا۔ جہانگیر نے اسے بلا کر شیر افگن کے پاس بھیجا۔ "اس سے کہنا کہ مہرالنساء کو شہنشاہ چاہتا ہے۔ اگر مزاحمت کرے تو قتل کر کے مہرالنساء کو لے آنا۔"

مسلم کو شک تھا کہ جہانگیر اس سے ناخوش ضرور ہو گا۔ اس لئے اس کام کو انجام دے کر وہ شہنشاہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ شیر افگن کے محل پر پہنچا اور شیر افگن کے روبرو آیا: "شہنشاہ نے آپ کی بیوی کو طلب کیا ہے۔"

"کیا؟" اور شیر افگن کے ماتھے پر شکن پڑی اور اس نے تلوار نکال لی اور وار ہونے لگے۔ مسلم کے ایک وار نے شیر افگن کو قتل کر دیا۔ ماما اس کے ساتھ آئی تھی۔ وہ محل کے اندر گئی اور

Scanned with CamScanner

مہرالنساء سے جہانگیر کے عشق کا حال بیان کیا۔ مہرالنساء کو اپنے شوہر کے قتل کا بڑا غم تھا۔ شہنشاہ کو اطلاع کی گئی۔ شہنشاہ نے مہرالنساء کو کسی طرح کی تکلیف پہنچانا گوارا نہ کی۔ عدت کے دن پورے کرنے کے بعد مہرالنساء مع اپنے بچوں کے آغا کے ساتھ آگرہ آگئی۔ بادشاہ نے شادی کا پیغام دیا۔ مہرالنساء نے سال بھر کی مہلت مانگی۔ آغا اس کے ساتھ رہی۔ مسلم کو الہ آباد کی صوبہ داری پر جہانگیر نے پھر مقرر کر دیا۔

آغا نے مہرالنساء کو نہایت درجہ ذہین پایا۔ حقیقت میں وہ شیر افگن کی بیوی نہیں بلکہ ہندوستان کی ملکہ ہونے کے قابل تھی۔ جہانگیر نے ایک محل اس کے لئے الگ کر دیا تھا اور اس کو نور محل کا خطاب دے دیا تھا۔ اکثر جہانگیر اس محل میں آجاتا۔ مہرالنساء منہ پر نقاب ڈال لیتی باتیں آغا کے ذریعہ ہوتیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا توں توں براہ راست باتیں ہونے لگیں۔ نقاب بھی کبھی کبھی ہٹ جاتی۔ آخر کو عید کا چاند دکھائی دیا۔ شہنشاہ نور محل کے پاس آیا اور یہ مصرع پڑھا:

ہلال عید بر اوج فلک ہویدا شد

نور محل نے نقاب الٹ کر فوراً جواب دیا:

کلید مے کدہ گم شدہ بود پیدا شد

شہنشاہ نے بڑھ کر اس کا منہ چوم لیا۔ آغا وہاں سے بھاگ کر الگ ہو گئی۔ عید کے دن بادشاہ کا نکاح ہوا۔ نور محل کو اب نور جہاں کا خطاب ملا۔ آغا مسلم کے پاس الہ آباد آگئی۔ نور جہاں کے ساتھ رہ کر اسے مذہب شیعہ کی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ ایک دن مسلم سے اور اس سے یوں باتیں ہوئیں۔

"اسلام میں شاہی وراثت کا مسئلہ بڑا ہی گڑبڑ کر دیا گیا؟"

"یہ نور جہاں سے کہا سیکھا؟"

"وہ ٹھیک کہتی ہیں .... اچھا تم تو شیعہ ہو۔"

شیعہ

"ہاں میں امام رضا کی اولاد میں ہوں۔"

"تم یقین کرتے ہو کہ علی وصی رسول تھے کہ نہیں؟"

"میں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا۔ کیوں تم کو یہ معاملہ نور جہاں نے بتایا ہوگا۔"

"نور جہاں کے لئے یہ معاملہ مذہب کی جڑ ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ پہلے تین خلیفہ......"

"جانے دو یہ رافضیوں کا عقیدہ۔ ایران میں سب رافضی ہیں۔"

"ہمایوں بھی شیعہ ہو گیا تھا اور بیرم خاں شیعہ تھا ہی۔"

"مگر اکبر اس سے بھی بالاتر رہا۔ شیخ سلیم چشتی نے اسے گمراہ نہ ہونے دیا۔ آخر تک وہ سچا مسلمان رہا۔ نماز کا پابند رہا۔"

"مگر ڈھلملاتا رہا۔"

"ڈھلملانے کا اس کے یہاں سوال نہیں اٹھتا۔ تحقیق کرنے کے لئے وہ پیدا ہوا تھا اور وہ تحقیق کرتا رہا۔ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے اور شیخ سلیم چشتی سے اس کے عقیدے میں کبھی فرق نہ آیا۔"

"جہانگیر کو نور جہاں شیعہ کرے گی ضرور۔"

"یہ ممکن نہیں۔"

"مجھے تو شیعہ مذہب زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ آل رسول سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔"

"آل رسول سے بڑھ کر ہم کب کسی کو مانتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ۔"

"مگر ان کے دشمنوں سے بھی محبت۔"

"کیسے معلوم کہ کون دشمن تھا۔"

"واہ اس کا علم ضرور حاصل کرنا چاہیے۔"

اور بیشتر وہ ایسی بحث میں پڑ جاتے کہ ایک دوسرے سے کشیدہ ہو جاتے۔ مگر پھر

Scanned with CamScanner

تھوڑی دیر کے بعد سب کچھ بھول کر ادب اور شاعری پر باتیں کرنے لگتے۔ نظیری کی غزلیں آغا کو زیادہ پسند تھیں۔ وہ ان کو گانے لگتی۔ عرفی کا سارا کلام مسلم نے جمع کیا تھا وہ اس کو پڑھنے لگتا۔

"مذہب کا دور ختم ہو گیا پیاری آغا اب تہذیب کا دور ہے۔"

"مذہب کو بھی تہذیب کے اندر آ جانا ہے۔ امامیہ مذہب تہذیب اور مذہب کا امتزاج ہے۔ ایرانی تہذیب اور دین محمدی کو ایک کرتا ہے۔"

نورجہاں کو آغا سے خاص انسیت ہو گئی تھی۔ اس نے آغا کو بلا کر اپنے ساتھ جہانگیری محل میں رکھا۔ مسلم الہ آباد ہی میں رہا۔ کبھی کبھی آغا الہ آباد آ جاتی یا مسلم آگرہ پہنچ جاتا۔ جہانگیر کو آگرہ سے زیادہ لاہور پسند تھا اور وہ مہینوں لاہور کے قلعہ میں رہتا۔ گرمیوں میں کشمیر کی سیر کو جاتا۔ نورجہاں کا ساتھ ہونا ضروری تھا اور نورجہاں کے لئے آغا کو چھوڑنا شاق گزرتا تھا۔ آغا نورجہاں کو عورتوں میں وہی مقام دیتی تھی جو مسلم اکبر کو دیا کرتا تھا۔ ہندوستان میں مسلم مرد کے ذہن کا کمال اگر اکبر تھا تو مسلم عورت کے ذہن کا کمال نورجہاں تھی۔ جیسے اکبر کی شان ایک خاص قسم کی تھی ویسے ہی نورجہاں کا حسن بھی ایک مخصوص چیز تھا۔ دونوں عام عقلی معیاروں سے الگ تھے۔ جہانگیری محل میں ملکۂ عالم کا وجود قدرت کا عجیب کرشمہ نظر آتا تھا۔ آگرہ کا قلعہ اپنی جگہ پر ایک پوری کائنات تھا اور اس کی مالک نورجہاں تھی۔

جہانگیر نورجہاں کا جیتا غلام تھا۔ کوئی لمحہ وہ نورجہاں سے الگ نہ ہوتا۔ جہانگیری محل میں دونوں چھپر کھٹ پر آمنے سامنے بیٹھتے۔ دونوں ساتھ کھانا کھاتے۔ دونوں نہروں کے کنارے ساتھ ساتھ پھرتے۔ دونوں نہر کے پاس تخت پر ساتھ ساتھ بیٹھ جاتے مچھلیوں کا شکار کرتے۔ ہزاروں قسم کی باتیں کرتے۔ رموز ملکی میں نورجہاں ہی رائے دیتی اور جہانگیر اس کی رائے کو مانتا۔ آغا اس کے ساتھ ہوتی اور دیکھا کرتی کہ شہنشاہ اور ملکہ کی محبت میں جنسی رجحانات کا بہت ہی کم دخل تھا۔ جہانگیر کی محبت زیادہ تر ذہنی اور روحانی تھی۔ جہانگیر خود شاعر نہ تھا مگر اشعار

کی اصلاحات خوب کرتا تھا۔ اکثر وہ تزک جہانگیری کا مسودہ ٹھیک لکھتا اور جملوں کو نورجہاں کو سناتا۔ اکثر ترتیب سب کو نورجہاں درست کرتی۔ جہانگیر بادشاہ تھا اور اکثر نورجہاں سے الگ ہو کر امور ملکی میں وقت صرف کرتا۔ اس وقت نورجہاں اور آغا ملکہ کے درمیان باتیں ہوتیں۔

ایک دن ملکۂ عالم پھول توڑتی ہوئی ایک حوض کے پاس آئیں۔ آغا ان سے دو قدم پیچھے تھی۔ حوض میں گلاب کے پھول تیر رہے تھے۔ گلابی پھولوں سے کھینچ کر ملکہ کی ہتھیلی پر پنکھڑیوں کو آتا ہوا اور پھر پانی پر گرتا ہوا دیکھتی رہیں۔ اکدم سے ملکہ نے اپنی ہتھیلی دیکھی اور بولی "یہ چکنائی"۔

آغا نے نہایت پیار سے ہتھیلی کو اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا: "جی ملکۂ عالم چکنائی معلوم ہوتی ہے۔"

ملکہ نے اب ہر پھول کو اٹھا اٹھا کر دیکھا اور اس پانی پر بھی غور کیا جس پر پھول تیر رہے تھے۔ کافی دیر تک پھولوں اور پانی کا مطالعہ کرتی رہی پھر بولی "عطر گلاب"۔ اسی وقت بارہ دری میں خواصوں نے گلاب کے پھولوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ ملکہ عطر نکالنے بیٹھ گئی۔ ایک کٹورہ بھر کر اس نے اور آغا نے عطر نکال لیا۔ "ادب با ملاحظہ ہوشیار" کی آواز بلند ہوئی۔ جہانگیر اپنی پوری شان سے ملکہ کو عاشق زار کی طرح دیکھتا ہوا سامنے آیا۔ ملکہ نے کٹورہ بڑھاتے ہوئے کہا "شہنشاہ عالم یہ گلاب کا عطر"۔ جہانگیر نے اپنے کپڑوں میں لگایا۔ ملکہ کے کپڑوں میں لگایا۔ حکم دیا کہ شاہی عطاروں سے کہو کہ اس فن کو مکمل کریں۔ اس روز تمام قلعہ میں دھوم مچ گئی کہ ملکہ نے گلاب کا عطر دریافت کیا۔ کچھ ہی عرصہ میں ساری دنیا گلاب کے عطر سے واقف ہو گئی۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ جہانگیر کی نورجہاں سے محبت بڑھتی ہی گئی۔ جب وہ دربار عام میں تخت پر بیٹھتا تو ملکہ پردے کے پیچھے بیٹھ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔ تمام امور پر فیصلے ملکہ کے ہاتھ کے اشارے سے ہوتے۔ ملک بھر میں مشہور ہو گیا کہ

حکومت ملکہ نورجہاں کرتی ہیں۔ جہانگیر بھی کہتا کہ دو پیالے شراب اور نورجہاں کے سوا اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ مگر پھر بھی وہ اکبر کا لڑکا تھا۔ جو عدل کا خون اس میں تھا اور عدل کا وہ خاص طور پر دلدادہ تھا۔ اس نے عدل کے گھنٹے کو اکبر سے کہیں زیادہ اہمیت دے رکھی تھی۔

ایک روز سہ پہر کے وقت جہانگیر باغ میں نورجہاں کے پاس بیٹھا تھا۔ اپنے مخصوص جام سے جس میں سے شراب فوارے کی طرح نکلتی تھی۔ شراب پی رہا تھا کہ گھنٹے کی آواز سنائی دی۔ [illegible] وہ لپکتا ہوا قلعے کی فصیل کے پاس آیا۔ نورجہاں اور ماما بھی پیچھے پیچھے آئیں۔ انھوں نے سنا کہ دیوار سے جھک کر جہانگیر کہہ رہا تھا "فریادی ہم آگئے" فریادی کی آواز ان دونوں کو سنائی نہ دی۔ جہانگیر نورجہاں کو خون کی نگاہ دیکھتا ہوا پلٹا اور قلعے کے باہر چلا گیا۔ وہ دونوں فصیل پر آگئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے دیکھا کہ جہانگیر اکیلا گھوڑے پر سوار چلا جا رہا ہے۔ چند سپاہی اس کے پیچھے بعد میں گھوڑے دوڑاتے نظر آئے۔ کافی دیر تک وہ دونوں کھڑی رہیں۔ پھر دیکھا کہ بادشاہ چلا آ رہا ہے اور اس کے ساتھ مشکیں بندھی ہوئی ایک ملزم بھی ہے۔ جب بادشاہ قلعہ کی دیوار کے پاس پہنچا تو ملکہ اکدم سے بولی "ارے یہ میرا بھائی ہے۔"

بادشاہ محل کے پاس دو پہنچا۔ مگر ملکہ کی اس سے کوئی سوال کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ دوسرے دن جہانگیر دربار عام میں تخت پر آ کر بیٹھا۔ ملکہ اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی۔ ملکہ کا بھائی پیش ہوا۔ بادشاہ نے قاضی سے فتویٰ طلب کیا۔ قاضی نے کہا ملزم نے ایک باعزت ہندو زادی کے ساتھ زبردستی کی۔ اس کے گھر پر جا حملہ کیا۔ ملکہ کی عزیزداری کا بیجا فائدہ اٹھا کر سرکاری سپاہیوں کو دھمکایا...... اس کی سزا جلتا کڑھاؤ......"

بادشاہ نے حکم دیا کہ تین کڑھاؤ تیار کئے جائیں۔ فوراً دیوان عام کے سامنے صحن میں چبوترے پر تین کڑھاؤ الگ الگ رکھ دیئے گئے اور ان کے نیچے آگ روشن کر دی گئی۔ ان کو کڑوے تیل سے بھر دیا گیا۔ تیل کھولنے لگا تو ملزم کو ایک کڑھاؤ میں ڈال دینے کا حکم ہوا۔ تھوڑی

دیر میں وہ جل کر کوئلہ ہو گیا۔ بادشاہ تخت سے اٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا محل کی طرف چلا۔ ملکہ پیچھے بالکل خاموش ساتھ تھی۔ جہانگیری محل میں تخت پر جا کر بیٹھا اور ملکہ اس کے سامنے بیٹھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ملکہ سے کہا۔ "ملکہ عالم کیا سوچ رہی ہو؟"

"جہاں پناہ آپ نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہ آئی۔"

"کیا؟"

"ایک کڑھاؤ استعمال ہوا۔ یہ تین کڑھاؤ کیوں چڑھائے گئے تھے۔"

بادشاہ مسکرا کر بولا۔ "ملکہ دوسرا کڑھاؤ اس لئے تھا کہ اگر تم بھائی کی محبت میں میرے شانے پر ہاتھ کو جنبش دیتیں تو تم کو دوسرے کڑھاؤ میں ڈلوا دیا جاتا۔"

"اور تیسرا کڑھاؤ؟"

"ہاں ملکہ جب تم دوسرے کڑھاؤ میں جل جاتیں تو ما بدولت زندہ رہ کر کیا کرتے۔ تیسرے کڑھاؤ میں ہم خود کود جاتے۔"

اس کے بعد اشارہ پا کر آہٹ آئی۔ انصاف اور نورجہاں سے محبت کا یہ [illegible] عجیب مثال تھا۔ مگر جہانگیر کو انصاف نورجہاں سے زیادہ پیارا تھا۔

ایک دن اور ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ملکہ تیر اندازی کی بڑی شائق تھی۔ سہ پہر کے وقت وہ تیر کمان لئے ہوئے جہانگیری محل کے سامنے چبوترے پر کھڑی تھی۔ جنگلے کے نیچے سے آ کر ایک جانور دکھائی دیا۔ اس نے خادمہ کو اشارہ کیا۔ ملکہ نے تاک کر تیر مارا۔ تھوڑی دیر کے بعد عدل کا گھنٹہ بجتا سنائی دیا۔ کچھ عرصہ گزر گیا۔ وہ خادمہ ملکہ کی طرف بڑھتے ہوئے۔ تیر دیکھا! اور گرفتاری کا حکم سنا کر ملکہ کے ہاتھ پیچھے سے باندھ دئیے۔ ملکہ کو رات قید میں [illegible] گیا۔ قیدیوں کا کھانا دیا گیا۔ دوسرے دن دربار عام میں ایک طرف پردے کے پیچھے ملکہ کو ساتھ لا کر اتاری گئیں۔ ایک عورت فریادی پیش کی گئی۔ بادشاہ نے دریافت کیا: "کیا فریاد کرتی ہے؟"

Scanned with CamScanner

سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔"

پروین مہابت خاں کے پاس پہنچی۔ وہ شراب کے نشے میں تھا۔ نورجہاں کا نام سنتے ہی یہ شعر پڑھنے لگا۔

بیا کہ از گہرت یاد می کند دریا
بیا کہ تشنہ لبت را طلب کند تسنیم

"یہ بھی یہی شعر پڑھنے والی تھی۔"

مہابت خاں اٹھ کھڑا ہوا کمر سے تلوار باندھی اور پروین کے ساتھ ہو لیا۔ نورجہاں کے خیمہ میں داخل ہوا۔ نورجہاں خود چہرہ پر نقاب ڈالے سامنے آئی اور بولی "آپ تو سپہ سالار اعظم۔ بلکہ اب شہنشاہ اعظم کہنا چاہیے۔ یہ ہم عورتوں سے ملنے کے لئے بھی تلوار کمر میں لگا لینے کی ضرورت تھی۔"

مہابت نے تلوار اتار کر الگ رکھ دی۔ پروین نے اسے اٹھا لیا۔ ملکہ نے خاصدان پیش کیا۔ مہابت نے پان کھایا۔ ملکہ نے پھر جام شراب کا پیش کیا۔ مہابت پئے ہوئے تھا۔ پھر بھی پورا چڑھا گیا۔ نشے میں چور ہو گیا۔

"تو حضور شہنشاہ اعظم۔ اب اس لونڈی کے لئے کیا حکم ہے۔"

"ملکہ۔ ملکہ تم ملکہ ہو۔ ملکہ ہی رہوگی۔ تم مہابت کو حکم دو کہو تو ابھی گردن کاٹ کر تمہارے پیروں پر ڈال دے۔"

مہابت یہ کہہ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے پروین نے اس کے جسم پر پھندا ڈال دیا۔ چار پانچ اور عورتوں نے آ کر اور پھندے ڈالے وہ بالکل کس گیا اور گر پڑا۔ کچھ خواجہ سراؤں نے آ کر اسے اور بھی اچھی طرح باندھ دیا۔ ملکہ بولی "شہنشاہ اعظم ختم ہو گئی بادشاہت" اور خوب کھلکھلا کر ہنسی۔ مہابت کو قتل کا حکم دیا۔ خواجہ سرا اُسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ ملکہ نے خود سپہ سالاری کا اعلان کر دیا۔ جہانگیر کا اجودھیا بائی سے لڑکا شہریار جو ملکہ کی شیر افگن سے لڑکی کا میاں تھا نائب سپہ سالار مقرر ہوا۔ ساری فوج اب ملکہ کے حکم سے لاہور میں داخل ہوئی۔

113

وہ ملکہ کی اس چال کی دھوم پورے ہندوستان میں پہنچ گئی۔ آگرہ میں ملکہ کا بھائی آصف جاہ وزیر سلطنت اور نظام الملک تھا۔ اس کی لڑکی ارجمند بانو خسرو کے چھوٹے بھائی خرم کے ساتھ بیاہی تھی۔ خرم دکن میں تھا۔ مگر آصف جاہ نے شہنشاہ کی معزولی کا حال سن کر اسے آگرہ [illegible]

پروین ملکہ کے ساتھ ہی تھی کہ بادشاہ [illegible] آگرہ [illegible] ہو چکا تھا کہ [illegible] آصف جاہ نے [illegible] بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اب [illegible] کی فتح یابی کا اعلان ہو گیا وہ فوج لے کر نورجہاں کی [illegible] آیا [illegible] اور آرام طلب تھا اور ملکہ بھی بوڑھی عورت تھی۔ خرم نے جلد [illegible] پا لیا اور شہریار اور نورجہاں کو قید کر لیا [illegible] لاہور بھیج دیا۔ ملکہ [illegible] باغ میں قید رہی۔ جہانگیر کے مقبرے کی تعمیر [illegible] پروین آخری وقت تک ملکہ کے ساتھ رہی۔

۲

شہنشاہ شاہ جہاں کی سواری دہلی کے لال قلعہ سے نکل رہی تھی۔ سب میں آگے سپہ سالار مہاراجہ جسونت سنگھ گھوڑے پر سوار ننگی تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد شہنشاہ کا ہاتھی تھا۔ کمخواب کی جھولیں پڑی ہوئی۔ پیروں میں گھنگھرو بجتے ہوئے۔ اس پر گنگا جمنی ہودا رکھا ہوا۔ ہودے کے بیچ میں شہنشاہ تاج پہنے ہوئے بیٹھا ہوا۔ اس کے پیچھے ایک ملازم چتر لگائے ہوئے اور دوسرا چنور جھلتا ہوا۔ بادشاہ کا لباس نہایت زرق برق تھا اور ملازمین کی وردیاں منقش تاروں کی تھیں۔

بادشاہ کے ہاتھی کے سامنے اس کے چاروں لڑکے دارا، مراد، اورنگ زیب اور شجاع گھوڑوں پر سوار آ رہے تھے۔ دارا کا گھوڑا دو قدم آگے تھا۔ اس کے بعد ایک قطار منصب داروں کے گھوڑوں کی تھی جن میں سکھ بھی تھا۔

کچھ ہی دور جا کر دارا کا گھوڑا بگڑا اور الف ہو گیا۔ شہنشاہ نے جھک کر کہا "مہاراجہ" جسونت سنگھ نے دست بستہ عرض کی "جہاں پناہ غلام نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ یہ گھوڑا صاحبزادے بلند اقبال کے بس کا نہیں ہے مگر صاحبزادے نہ مانے۔"

گھوڑا پھر الف ہوا اور دارا زمین پر آ رہا۔ اورنگ زیب اپنے گھوڑے پر سے اچک کر اس گھوڑے کی پیٹھ پر آ گیا اور اس طرح لگام پکڑی کہ گھوڑا بے بس کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے تحسین سے اورنگ زیب کو دیکھا۔ جسونت سنگھ نے عرض کی "جہاں پناہ شہزادے اورنگ زیب اسے سنبھال لیں گے۔"

دارا زمین سے اٹھ رہا تھا تو ایک ننگا فقیر اس کے پاس پہنچا اور اس کے کپڑے جھاڑنے لگا۔ اورنگ زیب کے خالی گھوڑے کی لگام پکڑ کر اس نے دارا کو اس پر بٹھا دیا۔ دارا نے ننگے فقیر کے ہاتھ چومے۔ اورنگ زیب نے اسے دھتکارا۔ فقیر رباعی پڑھنے لگا۔

سرمد بجہاں بسے نکونام شدی
از مذہب کفر سوئے اسلام شدی
آخر چہ خطا دیدی باللہ و رسول
سرگشتہ مرید لچھمن و رام شدی

سب جان گئے کہ فقیر سرمد شاہ تھے۔ وہ جلوس سے الگ ہٹ گئے۔ ایک اور رباعی پڑھتے ہوئے جانے لگے۔

سرمد اگرش وفاست خود می آید
ور آمدنش بجاست خود می آید
بیہودہ چرا در پئے او می گردی
سرمد گر او خداست خود می آید

شاہی سواری آگے بڑھی۔ اورنگ زیب کی ران کے نیچے شریر گھوڑا بے چوں و چرا چلا جا رہا تھا۔

سواری قلعہ کے پیچھے پہنچی۔ ایک اونچے ٹیلے پر ایک بارہ دری بنی تھی جس میں شہنشاہ جلوہ افروز ہوا۔ جسونت سنگھ اور چاروں شہزادے بارہ دری کے داہنی طرف گھوڑوں پر سوار رہے۔ نیچے خالی میدان میں دو مست ہاتھی لائے گئے اور ان کی لڑائی شروع ہوئی۔ دونوں ہاتھی بری طرح گتھے ہوئے تھے کہ دارا نے اورنگ زیب کے گھوڑے کو ایڑ دیدی۔ وہ تیز تو تھا ہی ٹیلے کے نیچے کود پڑا۔ اور تھوڑی دیر میں لڑتے ہوئے ہاتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ لڑنے والے ہاتھیوں میں سے ایک ڈر کر بھاگ نکلا۔ مگر دوسرا اورنگ زیب پر پلٹا۔ اورنگ زیب بالکل نہ ڈرا بلکہ اپنے بھالے سے ہاتھی پر وار کیا۔ مہاراجہ جسونت سنگھ نے بھی اپنا گھوڑا ٹیلے پر

سے کوہ دیا اور اورنگ زیب کے پاس آکر کہا: "شہزادے پیچھے جائیے" اور خود ہاتھی کی سونڈ پر وار کرنے لگا۔ اورنگ زیب پیچھے پہنچ کر ہاتھی کی دم کو زخمی کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہاتھی بھاگ گیا۔ اورنگ زیب اپنے گھوڑے کو جا راجہ کے گھوڑے کے پاس لا کر بولا "چاچا جی آپ نے میری جان بچائی۔ میں آپ کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔"

"شہزادے میرے کوئی بچہ نہیں ہے میں آپ کو سب سے زیادہ چاہتا ہوں۔ راجپوت خون آپ میں سب سے زیادہ زور رکھتا ہے۔"

بادشاہ بارہ دری میں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اپنے ہاتھی پر بیٹھا اور سواری پھر چلی، وہاں ایک نیا محل وہ باغ بادشاہ کو دکھانا چاہتا تھا۔ سواری وہاں پہنچی۔ سب لوگ اندر داخل ہوئے مگر اورنگ زیب دروازے ہی پر کھڑا رہا۔ بادشاہ محل دیکھ کر باہر آیا۔ اس نے پوچھا: "اورنگ زیب تم کیوں اندر نہیں گئے۔"

"جہاں پناہ قبلۂ عالم اس محل کا ایک ہی دروازہ ہے۔ اگر ہم کو کوئی مارنے لگتا تو کہیں نکلنے کی راہ نہ تھی۔ اور اگر حضور کو کوئی گھائل کر دیتا تو میں دروازے پر بدلہ لینے کے لئے تھا ہی۔"

شہنشاہ خاموش رہا۔ سواری قلعہ واپس پہنچ گئی۔ مسلم دارا کے ساتھ اس کے محل میں آیا۔ دارا اکبر کا صحیح پرپوتا نظر آتا تھا۔ اسے بھی تمام فنون سے دلچسپی تھی اور عالموں پر اعتقاد تھا۔ یہاں بابا لال نانگا فقیر گاتا چلا آیا۔ یہاں سرمد شاہ بھی آتے اور اپنی رباعیاں سناتے رہے۔ بابا لال راما نند اور سرمد شاہ کبیر کے جانشین نظر آئے۔ دارا خود ایک کتاب مرج البحرین تصنیف کر رہا تھا۔ اس کتاب کو وہ خود لکھ رہا تھا۔ رات کے وقت ایک راجپوت لڑکی نے ناچ دکھایا۔ دارا اس پر عاشق تھا اور اس کو نادرہ کہتا تھا۔ مگر دارا میں اکبر کی شان کی جگہ تجبر تھا۔ اکبر کے جوش کی جگہ آرام طلبی تھی۔ شاہجہاں کی شاندار حکومت کی پیداوار لاڈلوں کا پالا ہوا شہزادہ۔ ایک تیز گھوڑے کو نہ سنبھال سکا تو ہندوستان کی حکومت کو کیا سنبھالے گا۔

مسلم اورنگ زیب کے محل میں بھی حاضر ہوا۔ یہاں اسے مذہب اہلسنت ایک نئے رنگ میں دکھائی دیا۔ شہزادہ نماز کا پابند تھا۔ فقیہوں کے ساتھ رہتا تھا۔ زیادہ تر خاموش رہتا۔ قرآن مجید لکھنے میں مصروف رہتا — نصیرالدین شاہ کی مثال معلوم ہوتا تھا مگر وہ بہتش کا لڑکا نہیں اکبر کا پوتا تھا۔ پورا سپاہی تھا بے مثل تیغ زن اور بے مثل سوار۔ جوانی میں بھی زاہد خشک۔

مسلم کو لال قلعہ کے دیوان خاص میں بھی حاضر ہونے کا موقع ملا۔ شاہجہاں تخت طاؤس پر بیٹھا تھا۔ دور سے یہ تخت ناچتے ہوئے مور کی طرح دکھائی دیتا۔ اس میں ایسے جواہرات لگے تھے جن کی چمک پورے دیوان کو منور کرتی تھی۔ بادشاہ کے سر میں ایک ہیرا لگا تھا جس کو کوہ نور ہیرا کہا جاتا تھا۔ دیوان خانہ کی دیواروں پر مینا اور پچی کاری کا کام قیامت تھا۔

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمیں نست و ہمیں نست

یہ شعر مسلم نے دیواروں پر لکھا دیکھا۔ "فردوس" اس نے سوچا "یہ عجیب فردوس ہے۔ قدرت کی بنائی ہوئی نہیں مصنوعی فردوس۔ شاہ جہاں کے دربار کی تمام شان مصنوعی تھی۔ وہ شان جو خوب قائم تھی مگر جس کا مٹ جانا ضروری تھا کیونکہ اس میں قدرت کی ترقی کرنے والی طاقت نہ تھی۔"

شہنشاہ بہت مغموم تھا۔ اکبر بھی اکثر غم کے عالم میں ڈوب جایا کرتا تھا۔ مگر اکبر ایسے عالم میں آنے پر سب سے الگ ہو جاتا تھا اور غور کرنے لگتا تھا۔ شاہ جہاں ممتاز محل کے انتقال سے مغموم تھا۔ اس نے بڑی عمدہ عمارتیں بنوائی تھیں۔ اب ممتاز محل کے لئے ایسا مقبرہ بنوانا چاہتا تھا جس کی مثل اور نظیر دنیا میں نہ ہو۔ شہنشاہ چاہتا تھا "ایسا مقبرہ جو ممتاز کے حسن کو سنگ مرمر کے ذریعہ لافانی کر دے اور دنیا بھی مقبرہ سنگ موسیٰ کا ہو دولت کے ہاتھ کو دوام دے دے۔"

دیوانِ خاص میں مٹی کے بنے ہوئے بہت سے ماڈل رکھے تھے۔ شہنشاہ کو کوئی پسند نہ آتا۔ وہ کہتا میں نے خواب میں ایک شکل دیکھی ہے کوئی ویسی ہی بنائے۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو بنائے۔ کون بنائے گا کس نے ممتاز کو دیکھا تھا کس نے اس کے حسن کا مخصوص مشاہدہ کیا تھا۔"

اتنے میں ایک سردار نے اُٹھ کر زمینِ خدمت کو چوما۔ کورنش بجا لایا اور بولا "جہاں پناہ میرے گاؤں کے ایک اندھے کمہار نے ایک شکل بنائی ہے وہ حاضر ہے۔ اگر حکم ہو تو وہ کمہار حاضرِ خدمت کیا جائے۔"

"حاضر ہو۔" بادشاہ نے حکم دیا۔

ایک اندھا شخص حاضر کیا گیا۔ اس نے ایک تھیلے میں سے ایک ماڈل نکال کر زمین پر رکھا۔ شہنشاہ دیکھتے ہی پھڑک گیا۔ "اے اندھے تو نے میرے خواب کی شکل کو کہاں دیکھ لیا۔"

"جان کی امان پائے تو غلام عرض کرے۔"

"تیری جان تجھ کو بخشی۔ کہہ جو کچھ کہنا ہے۔"

"جہاں پناہ۔ اس غلام کو بچپن میں ممتاز محل۔ ارجمند بانو کے ساتھ رہنے اور کھیلنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔"

آصف جاہ وزیرِ اعظم نے غور سے دیکھ کر کہا۔ "ارے تو شیراز ہے۔"

"جی عالیجاہ" اندھے نے کہا۔ "زندگی بھر یہ غلام ارجمند بانو کو یاد کر کر کے یہ شکل بناتا رہا۔ آج جہاں پناہ نے اسے پسند فرما کر مجھے زندگی بخشی۔"

"اسی شکل کا تاج محل بنے" شاہی فرمان جاری ہو گیا۔

شاہ جہاں نے اپنی سلطنت کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ بنگال شجاع کو گجرات مراد

کو، پنجاب، ملتان کابل داراشکوہ کو دکن اورنگ زیب کو دیا۔ مسلم اورنگ زیب کے ساتھ دکن پہنچا۔ یہاں اس کا پھوپھا صوبیدار تھا۔ شہزادہ آگے آگے تھا اور مسلم پیچھے پیچھے ایک باغ میں داخل ہوئے۔ ایک نہایت درجہ حسین لڑکی اچک اچک کر انار کے پیڑ سے انار توڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شہزادہ اس کو دیکھ کر بیتاب ہو گیا۔ لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ شہزادے نے ہاتھ سے انار توڑا اور اس لڑکی کو دیا۔ لڑکی نے عجب انداز سے شہزادے کو دیکھا اور پھر بھاگ گئی۔ شہزادہ زمین پر گر گیا۔ مسلم نے پاس جا کر دیکھا تو بے ہوش تھا۔ اس نے شور مچایا۔ لوگ آ گئے۔ شہزادے کو اٹھا کر محل کے اندر لے گئے۔ طبیب آئے۔ کوئی مرض کی تشخیص نہ کر سکا۔ پردہ کرایا گیا۔ شہزادے کی پھوپھی تشریف لائیں۔ شہزادے نے آنکھیں کھولیں اور باتیں کیں۔ وہ واپس چلی گئیں۔

مسلم شہزادے کی چھپرکھٹ کے نیچے بیٹھا تھا۔ شہزادے نے اس سے کہا۔ "مسلم وہ لڑکی اگر مجھے نہ ملی تو میں مر جاؤں گا۔"

"شہزادۂ عالم میں نے دریافت کیا اس کا نام ہیرا ہے اور وہ آپ کے پھوپھا کی منظورِ نظر ہے"

"میں نے ممی سے بھی ذکر کیا۔ وہ تھرا گئیں کہنے لگیں میرا شوہر بڑا ظالم ہے۔ اگر اس کو خبر ہو گئی تو وہ مجھے مار ڈالے گا۔ وہ شہنشاہ کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ ہیرا کو اس نے بڑی قیمت پر گجرات میں خریدا تھا۔ اب کیا ہوگا مسلم؟"

"حضور میں نے دریافت کر لیا ہے۔ آپ کی لونڈیوں میں ایک چتر بائی ہے۔ آپ کے عمو اس پر عاشق ہیں۔ ہیرا بائی کے بجائے اس کو لے لیں تو۔"

"میں ہزار چتر بائی بدلے میں دے دوں گا۔ تم جا کر انہی سے کہو۔"

مسلم چتر بائی کو لے کر صوبیدار صاحب کے پاس گیا۔ اور بولا "حضور کو یہ نذر پیش ہے میں شہزادے کی طرف سے آیا ہوں کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، مگر ایک شرط ہے۔"

"کیا شرط؟"

"ہیرا بائی کو شہزادے کے لئے دے دیجئے۔ ان کی جان جا رہی ہے۔"

"چھوڑ جاؤ اسکو یہاں اور لے جاؤ ہیرا کو۔"

مستقیم ہیرا کو لے کر شہزادے کے پاس آیا۔ شہزادے کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ہیرا بائی بھی بڑی خوش تھی۔ شراب کا ایک جام لئے ہوئے شاہزادے کے پاس آئی اور بولی

"آپ شراب نہیں پیتے مگر میرے ہاتھ سے یہ جام پی لیجئے۔"

شہزادے نے ہاتھ بڑھا کر جام لے لیا اور منھ سے لگایا ہی تھا کہ ہیرا بائی نے چھین کر پھینک دیا اور بولی۔ "مجھے محبت کا امتحان کرنا تھا۔ آپ کو گنہگار نہیں کرنا تھا۔"

اس کے بعد مسلم دونوں کو چھوڑ کر چلا آیا۔

اُم پروین لال قلعہ میں رہی شہزادی جہاں آرا کو اس سے خاص اُنسیت ہو گئی تھی اُسے بھی جہاں آرا اسی قدر نور جہاں کا عکس معلوم ہوتی جس قدر دارا مسلم کو اکبر کا عکس معلوم ہوتا تھا۔ جہاں آرا نہ اتنی حسین تھی اور نہ اتنی ذہین مگر تہذیب و ذوقِ ادب میں نور جہاں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ شہنشاہ جہاں آرا کو بہت چاہتا تھا اور پروین بھی اکثر اس کے سامنے دست بستہ کھڑی ہوتی۔ کھیل تفریحات سیر اور ناچ رنگ میں دونوں ساتھ رہتیں۔

آخر کو ایک دن شہنشاہ بیمار پڑا۔ شہر میں خبر مشہور ہو گئی کہ مر گیا۔ شہنشاہ نے جھروکے سے درشن دینا بند کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ دہلی کا تخت دارا کو دے کر خود آگرہ میں جا کر رہے اور ہر وقت اپنے شاہکار تاج محل کو دیکھتا رہے۔

مسلم کو دکن میں یہ افواہ پھیلتی ہوئی سنائی دی۔ اس نے شہزادے اورنگ زیب سے ذکر کیا۔ شاہزادہ خاموش رہا۔ کچھ عرصہ ہی میں دارا کے شہنشاہ ہو جانے کی خبر آئی۔ اورنگ زیب نے ایک خط دے کر مسلم کو مراد کے پاس روانہ کیا۔ اس کے بعد اورنگ زیب اپنی فوج لے کر گجرات چلا۔ راستے میں خبر ملی کہ بنگال میں شجاع نے دارا کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور مہاراجہ جسونت سنگھ فوج لیکر بنگال بھیجے گئے ہیں۔ مراد کے پاس پہونچتے ہی اورنگ زیب نے

مشہور کیا کہ ہندوستان کی حکومت مراد کے ساتھ دھوکا دہی بٹھلے گا اور سعدو دن کی فوجیں دارا سے لڑنے بڑھیں۔ دھرمت کے مقام پر جنگ ہوئی۔ دارا کی فوج بھاگی۔ اورنگ زیب کی فوج نے پیچھا کیا۔ بیکری پر پھر ایک معرکہ ہوا اب دارا کو شکست فاش ہوئی۔ مسلم کی ماتحتی میں ایک دستہ اس کا پیچھا کرنے چلا۔ اورنگ زیب آگرہ آیا۔ شاہجہاں یہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نے قلعہ پر پہرے بٹھا دیئے۔ خود اندر گیا اور باپ کو قید کا حکم سنایا۔ جہاں آرا اور پروین بھی قید ہو گئیں۔ اورنگ زیب نے عالمگیر کا لقب اختیار کیا اور شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔

دارا نے سکھ گرو تیغ بہادر کے یہاں پناہ لی تھی مستقیم نے اس کی مقدس خانقاہ کو گھیر لیا۔ دارا پھر فرار ہوا مگر کچھ ہی دیر بعد پکڑا گیا اسے دہلی لایا گیا مستقیم یہ سمجھتا تھا کہ دارا کو ایک چھوٹے ہاتھی پر بٹھا کر سارے شہر میں پھرایا جائے گا۔ جب دارا کا ہاتھی چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا ایک فقیر دوڑتا ہوا آیا اور بولا "شہنشاہ دارا تم نے ہمیشہ میری التجا قبول کی۔ اس وقت بھی میں تم سے بھیک مانگتا ہوں۔" دارا نے اپنا میلا دوشالہ اس فقیر کی طرف پھینک دیا۔ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے مجمع سے ایک چیخ نکلی مسلم دیکھتا گیا کہ سارا شہر دارا کے لئے رو رہا تھا۔ مگر کوئی کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

دارا کو قتل کر دیا گیا۔ گرو تیغ بہادر کو بھی پکڑ بلایا گیا اور اسے اورنگ زیب نے قتل کیا۔ اورنگ زیب نماز کے لئے جامع مسجد آ رہا تھا۔ سڑک پر اس نے دیکھا کہ سرمد شاہ ننگے ناچتے چلے آ رہے ہیں۔ "او ننگے یہ تیرا فعل خلاف شرع ہے۔" بادشاہ نے کہا۔

سرمد شاہ گانے لگے۔ رباعی

شاہ شاہا نیم ناصد چوں تو عریاں نیستم
ذوق و شوق سوزشم لیکن پریشاں نیستم
بت پرستم کافرم از اہل ایماں نیستم

یہ کہکر وہ مسجد کی سیڑھی کے پہلے زینے پر آئے اور رباعی کا چوتھا مصرع پڑھا:

سوختہ سجدی روم لیکن مسلماں نیستم

اورنگ زیب گھوڑے سے اتر چکا تھا۔ تلوار نکال کر سرمد کی گردن پر ماری۔ سرمد اپنا سر ہاتھ میں لئے ہوئے زینے پر چڑھنے لگے۔

"ارے کیا کرتا ہے دنیا گمراہ ہو جائے گی" پیر سبز کی آواز آئی۔ سرمد وہیں گر گئے۔ مسلم آگے بڑھا اور ایک اور سپاہی کی مدد سے ان کی نعش کو اٹھا کر پیر سبز کے پاس پہنچایا۔

اس رات مسلم کو نیند نہ آئی۔ دربار میں اس کا جانا ضروری تھا اور وہاں روز جیتے واقعات ہوتے۔ آخر کو اس نے بادشاہ سے آگرہ اپنی بیوی کے پاس جانے کی اجازت لے لی۔ تن تنہا وہ آگرہ چلا۔ دہلی سے دور پہنچ کر جنگل کی ہوا نے اسے بڑی فرحت بخشی۔ وہ سوچنے لگا۔ "یہ سب کیا ہو گیا۔ اکبر کہاں گیا۔ اکبر کے دو ٹکڑے ہو گئے۔"

اس کا گھوڑا قدم قدم چلنے لگا۔ اُمِ پروین کا تصور اس کے سامنے آیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ سامنے کھڑی ہے اور وہ بول اٹھا: "اماں یہ سب میں کیا دیکھ رہا ہوں۔"

وہ چونکا۔ اماں کا تصور غائب ہو گیا۔

اس کا دماغ ہی بدل گیا تھا۔ مغل دور نے اس میں ایک نئی قوت پیدا کر دی تھی۔ قوتِ فکر۔ عرفی کی شاعری کی صفت۔ عرفی ایک شیرازی یہاں آیا تھا اور تھوڑے ہی دنوں میں مارا گیا۔ اس کی مٹی بھی نجف پہنچ گئی۔ مگر اس دور کی رفتار کو جیسا وہ سمجھا ویسا کوئی اور شاعر نہ سمجھ سکا۔ عرفی بہت بڑا شاعر تھا۔ مگر اکبر۔ اکبر اعظم! اس سے بڑا بادشاہ کبھی کوئی نہیں ہوا۔ افلاطون کا فلسفی بادشاہ وہی تھا۔ فکر اور رواداری اس کا حق تھا۔ اس کا یہ حصہ دارا کو ملا تھا۔ مگر دارا لاڈلا بیٹا۔ بزدل۔ مغرور۔ ناکارہ۔ اورنگ زیب کو اکبر کی سیاست، ہمت، شجاعت ملی تھی۔ مگر خشک زاہد۔ یہ تو اکبر میں کہیں چھو کر نہیں گزرا تھا۔ یہ مذہبیت کسی اسلامی بادشاہ میں نہ تھی۔ کیا اورنگ زیب مثالی مسلم بادشاہ ہے۔ فقیہی اس کو کس قدر مانتے ہیں۔ اکبر نے کفر پھیلایا تھا۔ عالمگیر اسلام کو زندہ کر رہا ہے۔ "سچ تو یہ ہے سنّی مذہب کا وہ نمائندہ گنا جائےگا۔

تصوف، شیعیت، کفر سب کا وہ دشمن ہے۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے۔ معمولی کپڑے پہنتا ہے۔ گانے ناچ کو اس نے ٹھکرا دیا۔ بتخانوں کو منہدم کیا۔ اس کا عمل پورا اسلامی ہے۔ ہندوستان میں اب اسلام آیا۔ اکبر ہندو تھا۔ مگر دیکھیں یہ اسلام یہاں کب تک چلتا ہے۔ کس گھاٹ اترتا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔

وہ اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیتا تاکہ رفتار سے اس کے سوچنے کی طاقت سلب ہو جائے۔ سوچنا اس کے لئے تکلیف دہ تھا۔ مگر پھر جب وہ تھک جاتا تو گھوڑا قدم قدم چلنے لگتا اور وہ سوچنے میں محو ہو جاتا۔ اکبر کے جو دو ٹکڑے ہوئے۔ وہ ایک دوسرے سے برسرِپیکار ہوئے۔ ایک ٹکڑا دوسرے پر غالب آ گیا۔ وہ ٹکڑا کمزور تھا۔ تصوف، ہندویت، عیش، کمزور چیزیں ہیں۔ دارا مکر سے شہنشاہ ہو جانا چاہتا تھا۔ بغیر سیڑھی کے کوٹھے پر چڑھنا چاہتا تھا۔ کمزور۔ مگر اکبر صوفی بھی تھا، ہندو بھی تھا۔ عیاش بھی تھا۔ اس میں یہ سب چیزیں کمزوری کا باعث نہ ہوئیں کیونکہ اُس میں بابر غالب تھا۔ اس نے خود ہندوستان فتح کیا تھا۔ سپاہی تھا اور مفکر بھی اور عیش بھی کرتا تھا۔ دارا میں فکر و عیش موجود، سپاہی غائب۔ اورنگ زیب سپاہی ہے۔ پورا سپاہی ہے۔ کیا وہ مفکر نہیں؟ نہیں۔ زہد فکر کا قاطع ہے۔ اورنگ زیب کئی صدی پہلے کا مسلمان ہے۔ تصوف کے دور سے پہلے کا۔ خلفائے راشدین کے دور کا۔ اکبر کا جانشین نہیں۔ تنگ نظر۔ تنگ دل۔ پابند۔ خونخوار۔

اسی طرح سوچتا ہوا وہ آگرہ پہنچا۔ دور سے تاج محل آسمان پر ایک کہرا سے بنی ہوئی تصویر کی طرح دکھائی دیا۔ "کیا خوبصورت تصویر ہے۔ قیامت ہے قیامت۔" وہ قریب آیا۔ اب تاج محل کیسا عجیب بیٹھا ہوا کھلونا معلوم ہو رہا تھا جو زمین پر رکھا ہوا تھا۔ چاروں طرف ہرے ہرے درخت تھے اور بیچ میں یہ محل رکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جب وہ پہلے ہندوستان میں آیا تھا تو پیڑوں کی ہریالی ہی ہریالی سے [illegible] تھی۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ جھونپڑی پر جھونپڑی اور اب ان پیڑوں کے درمیان مسلم حکومت کا یہ کرشمہ نظر آ رہا تھا۔ یہ عمارتیں مسلم حکومت کا

بس ہیں۔ اور مغل حکومت کا اصل شاہکار یہ تاج محل ہے۔ شاہ جہاں نے بس یہ کیا
بگڑا یا جاتا تو کچھ نہ کر سکا۔ دنیا مار لیا۔ اکبر کا مقصد میں کام ختم ہو گیا۔ اورنگ زیب عالم ہے۔ اکبر کی
رکھی ہوئی بنیادوں کو چار چاند بھی لگا دے گا۔ ضرور لگا دے گا۔ مگر اکبر نے ہمایوں کا مقبرہ بنوایا
تھا جس کا کمال یہ تاج محل ہے۔ اکبر کے اس کام کو شاہجہاں نے پورا کر دیا۔ شاہجہاں اپنے
اس شاہکار کو بہت چاہتا ہے۔ وہ قلعہ میں قید ہے۔ مثمن برج میں بیٹھا ہوا ہے۔ ہر شیشے میں
تاج محل کا عکس پڑ رہا ہوگا۔

وہ جمنا کو پار کرنے لگا۔ گھوڑا پیرتا رہا۔ وہ تاج کو دیکھتا رہا۔ دریا سے یہ محل کچھ اور
ہی چیز نظر آ رہا تھا۔ اس میں کیا خوبی تھی۔ پلٹ کر اس نے اعتماد الدولہ کے مقبرے کی طرف بھی
دیکھا۔ یہ مقبرہ مینا کاری کا کمال تھا۔ اس کی نگاہ قلعہ میں سے جھانکتی ہوئی موتی مسجد
پر بھی پڑی۔ یہ صفائی اور سادگی کا کمال تھی۔ تاج میں دونوں خوبیاں تھیں۔ ہر خوبی تھی۔ ایک
مکمل شاہکار۔ کامل تخلیق اور پھر اس میں ایک عجیب روح تھی۔ بیان نہیں کیا جا سکتا تو سمجھنے
ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ تاج محل میں اکبر کی روح تھی۔ ہاں اکبر کی! وہ غور سے دیکھنے لگا۔ اسے
یہ خیال نہ رہا کہ دریا میں اس کا گھوڑا تیر رہا ہے۔ وہ محویت کے عالم میں دوسرے کنارے پر
پہنچ گیا۔

دریا سے نکل کر وہ قلعہ کی طرف جا رہا تھا تو اسے عرفی کا یہ شعر یاد آیا ہے

حریم کعبہ شکست و اساس قبلہ بہ بخت
بطرح تازہ یکے قصر بے قصور نہیم

یہ اکبر کی روح کا الفاظ میں ترجمہ تھا۔ اکبر ایک قصر بے قصور بنانا چاہتا تھا۔ سکندرہ
اکبر نے اپنے تمام جانشینوں کا مقبرہ بنایا تھا۔ مگر جہانگیر ہی لاہور میں دفن ہے۔ شاہجہاں
بھی اپنے لئے ماہی تاج سنگ موسیٰ کا بنوا رہا تھا۔ مگر نہیں اس نے یہ قصر بے قصور بنایا۔
وہ قلعہ میں پہنچ گیا۔ قلعہ کے محافظوں نے اسے پہچانا اور بڑے تپاک سے پیش آئے۔

فصیل کے کمروں میں سے ایک میں اس کے رہنے کا سامان کیا۔ یہاں اُمّ پروین اس سے
ملنے آئی۔ وہ بھی تاج محل کی سی چیز معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بیٹھا ہوا اسے دیکھتا ہی رہا۔ اس
کی مسکراہٹ اب ایک سنجیدہ اور معنی خیز نظر آ رہی تھی۔ اس کے سر پر چھپکا اور ٹیکا اس کے
بالوں کو ایک خاص رنگ دے رہے تھے۔ ٹیکے میں ایک پکھراج چمک رہا تھا اور چھپکے میں
کئی پنے اور ہیرے عجیب لو دے رہے تھے۔ قدرت کے کرشمے پر انسان کی فنکاری حاوی
معلوم ہو رہی تھی۔ پروین کا جسم بھی اب محض نازک نہیں رہ گیا تھا۔ بلکہ زیادہ بھرا بھرا معلوم
ہو رہا تھا۔ موم اور کرکی اور اس پر پشوازہ پیروں میں چست چوڑی دار پاجامہ۔ گورے
گلے میں سونے کا طوق سینے پر پڑی ہوئی ہیکل کلائیوں پر کڑے اور چوڑیاں۔ اس کے قدرتی حسن
کے اتنے ہی موزوں زیور تھے جیسے کہ پچی کاری کا کام تاج محل کے حسن کو دوبالا کرتا تھا۔ مسلم کے
جذبات بھی اب متوازن ہو گئے تھے......... پہلے وہ کچھ عمر کے بعد اپنی پیاری اما کو
دیکھ کر اس سے چمٹ جایا کرتا تھا مگر اب وہ اسے محویت کے ساتھ دیکھتا ہی رہا۔ اس کی محویت
بھی ایک نئی نوعیت کی تھی وہ اسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی مفکر کسی نئی شاہکار
کو دیکھے۔

"اما۔ تم بھی تاج محل کی طرح کی ہو گئیں۔"

"اور تم تو اورنگ زیب کی طرح نہیں ہو گئے۔"

"نہیں اما۔ اکبر کے وہ ٹکڑے دادا اور اورنگ زیب میرے اندر کشمکش کر رہے
ہیں۔ مگر تاج محل کو دیکھتے ہی وہ کشمکش ختم ہو گئی اور اب تم بھی تاج محل...... اما تمہارے
لئے یہ قید نہیں ہے۔ مجھے عالم پناہ نے یہ اجازت دیدی ہے۔ چلو ہم تم اب وہیں واپس چلیں
اپنے سنگم پر۔"

اما خاموش رہی۔ مسلم نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر بڑی با قاعدگی سے اس کے لبوں
پر بوسہ دیا۔

Scanned with CamScanner

"نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔ مسلم جہاں اب وہاں گھر کہاں ہے۔ باخسرو وہاں جا کر وہ بیمار ہی تھا اور مر بھی گیا۔ وہیں دفن بھی ہوا۔ ملکہ جہاں آرا باقی کو بھی وہیں جلا کر دیا گیا۔ نہیں میرا جی واپس جانے کو نہیں چاہتا۔"

"یہ کوئی وجہ نہیں۔ آؤ ہم اب اورنگ زیب کے پاس سے بہت دور چلا جانا چاہتا ہوں۔ ہر وقت ظلم اور ہر طرف فساد، بغاوت۔ آؤ چلو ہم اس سنگم کی لکیر کو بیٹھے دیکھتے رہیں گے۔ اس سے زیادہ سکون اور کہیں نہیں مل سکتا۔"

"مگر تم تو اورنگ زیب کے خاص آدمی ہو۔ دارا کو تم ہی پکڑ کر لائے۔"

"خاص آدمی تھا۔ اب نہیں ہوں۔ مجھے اس میں اکبر کا وہی کرشمہ دکھائی دیا تھا جو گجرات کی فتح کے وقت نمایاں ہوا تھا

کہ آفتاب زمیں تاجِ آسماں آمد

مگر اب کچھ نہیں۔ وہ خود غرض ملّا ہے۔ اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے جو یہ ملّا کہتے ہیں وہی کرتا ہے۔ مندر توڑتا پھر رہا ہے۔ ان میں زر کثیر نکل رہا ہے اسے ہتھیا رہا ہے اس میں ایک محمود غزنوی بھی چھپا بیٹھا ہے۔ مگر اکبر کا کچھ بھی اس میں نہیں۔"

"مگر میں جہاں آرا کو چھوڑ کر نہ جاؤں گی۔ وہ پوری نور جہاں ہے بلکہ نور جہاں سے بہتر ہے۔ اس میں ایرانی تعصب نہیں۔ شاہ جہاں کے بعد اسے ہی ملکہ ہونا تھا۔ اور پھر شاہجہاں مجھ کو اس قدر چاہتے ہیں کہ میرے جیتے ہی مر جائیں گے۔"

"کیا تم ان کو ممتاز محل کی سی نظر آتی ہو۔ ہاں ہاں۔ اگر تاج محل ممتاز محل کا ترجمان ہے تو تم تاج محل کی ترجمان ضرور ہو۔ مجھے تم تاج محل ہی کی سی معلوم ہو رہی ہو مگر ہم اور تم آخر کب تک رہیں گے۔"

"تم بھی یہیں رہو جب تک مجھے یہاں رہنا ہے۔"

اور دونوں آگرہ کے قلعہ میں رہے۔ پروین رات میں اس کے پاس آجاتی اور دونوں

فصیل پر بیٹھ کر چاندنی رات میں تاج محل کے نظارے سے محظوظ ہوتے۔ آخر ایک دن شاہجہاں کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ پروین اس کی تیمار دار رہی۔ رات بھر وہ بڑبڑاتا رہا اور کبھی ممتاز کہتا، کبھی ارجمند۔ صبح کو ہوش آیا تو اس نے حکم دیا کہ اسے اٹھا کر محراب کے سامنے لایا جائے جس کے شیشے میں تاج محل کی تصویر دیکھتا۔ کر اس کا رخ محراب کی طرف کر دیا۔ وہ عجیب عالم میں اسے گھور کر دیکھتا رہا اور پھر انتقال کر گیا۔ پروین نے محراب کی چادر ڈال دی۔

اورنگ زیب کو خبر دی گئی۔ اس نے تاج محل میں دفن کرنے کا حکم بھیجا۔ نعش کو لے کر بڑے قلعہ سے تاج محل کو چلے۔ مختصر سا ساتھ تھا۔ ممتاز محل کی قبر کے پاس ایک قبر کھودی گئی اور اس میں مغل خاندان کے سب سے زیادہ شاندار شہنشاہ کی نعش کو لٹا دیا گیا۔ قبر کو بنایا گیا۔ یہ تاج محل کہ ہر طرح سے مکمل آہنگ پر ایک دھبہ نظر آیا۔ سب لوگ واپس ہو گئے۔ مسلم وہیں رہ گیا۔ وہ سوچتا رہا کہ اس کامل محل میں شاہجہاں کی قبر ایک بدعت تو نہیں۔ ایک ایک پتھر، ایک ایک نقش، ایک ایک جالی ہر طرف سے متناسب نظر آتی ہے۔ قبر ہی بے تکی نظر آ رہی تھی۔ اورنگ زیب کو اس کا خیال نہ ہوا۔ اورنگ زیب کی حکومت تو اس آہنگ کو توڑ رہی تھی جس کی بنیاد اکبر نے مستحکم کی تھی اور جس پر کلس جلالِ شاہجہاں کے عہد میں ہو گئی تھی۔

وہ تاج محل کے چبوترے پر آ کر جمنا کو دیکھنے لگا۔ جمنا اس شان سے بہہ رہی تھی جیسی کہ ہمیشہ سے بہتی آئی تھی۔ بھرا بھرا چوڑا پاٹ۔ سبز پانی۔ گلابی نرم خرام عجیب دریا ہے۔ اس سرزمین کی دیوی۔ اس کی نگاہ جمنا کے پار ماہتی تاج کی بنیادوں پر پڑی۔ آہ شاہجہاں نے یہ بنیادیں سنگ موسیٰ کے تاج محل کے لئے رکھوائی تھیں۔ وہ یہ مقبرہ اپنے لئے بنانا چاہتا تھا۔ ادھر سنگ مرمر کا تاج ادھر سنگ موسیٰ کا تاج کیا اچھا سماں ہوتا۔ مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اکبر کا خواب بھی پورا نہ ہوا۔ اس نے سکندرہ اس خیال سے بنوایا تھا کہ اس میں تمام شاہانِ مغلیہ

کی قبریں بنیں گی۔ مگر وہاں جہانگیر بھی دفن نہ تھا۔ اگر شاہجہاں دلی میں مرتا تو ہمایوں کے مقبرے میں دفن کر دیا جاتا۔ اچھا ہوا کہ آگرہ کے قلعہ میں قید ہوا اور اپنے شاہکار میں دفن ہوا۔ وہ فنکار تھا۔ تاج محل کے معمار بہت سے لوگ تھے مگر فنکار وہی تھا۔ مغل بادشاہوں کا فن آخر کو عمارت سازی ہی ٹھہرا۔ وہ بادشاہ نہ تھے فنکار تھے۔ ہر چیز کو انھوں نے فن میں تبدیل کر دیا۔ فن کی ترویج دے دی۔ زندگی کو بھی ایک فن بنا دیا۔ سپہ گری بھی ایک فن ہوئی۔ کھانا، پہننا، اٹھنا بیٹھنا، ناچنا، گانا، شعر و سخن ان کے دور میں آ کر فن ہو گئے۔ مذہب بھی فن ہو گیا اس جاہل اکبر کا جو معجزہ تھا۔ وہ اپنے کو پیغمبر کہلوانا چاہتا تھا۔ وہ پیغمبر تھا۔ مذہب کا پیغمبر نہیں۔ تہذیب کا پیغمبر۔ اکبر نے تہذیب کو کمال پر پہنچایا۔ یہ تہذیب ہی پیک شاہجہاں تک بڑھاتی رہی۔ مگر فن تعمیر اس تہذیب کا سب سے اہم شعبہ ٹھہرا، اور یہ اس فن کا شاہکار۔ فن کا عظیم ترین شاہکار ہوا......

یوں ہی سوچتا ہوا اور نہر کے کنارے کنارے چلتا ہوا وہ پھاٹک کی طرف آ گیا۔ پھاٹک کے چبوترے کے زینوں پر پہنچ کر وہ بیٹھ گیا۔ سامنے نہر تھی جس کے دونوں طرف سرو کے پیڑ تھے۔ نہر میں تاج محل کا عکس پڑ رہا تھا۔ فواروں کی قطار محل کے عکس کو دو برابر کے حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ تناسب اور آہنگ کا یہ بھی ایک معجزہ تھا۔ شاہجہاں کے دور کے معماروں کا ذہن بھی کتنا ذہن [illegible] گیا تھا۔ اکبری تہذیب ہر فرد تک پہنچ گئی تھی۔ تاج محل کی ہر چیز اس کو ایک مکمل شعر معلوم ہوتی۔ اور وہ محل ایک غزل نظر آیا جس کا ہر شعر پُرکاری کا کمال تھا۔ وہ تاج محل کو دیکھتا رہا۔ عجیب محویت کا عالم اس پر طاری ہوتا رہا۔ اسے اپنی محویت یاد آئی جو اس نے پہلے دن گنگا پر سفر کرنے میں محسوس کی تھی۔ پہلے مناظر قدرت نے اس طرح محو کر دیا تھا اور آج انسان کا کمال اسی طرح محو کر رہا تھا۔ محمود غزنوی سے لے کر شاہجہاں تک کتنا زمانہ گزر چکا تھا۔ اس زمانے میں کیا ترقی ہوئی تھی۔ محمود کے خیموں سے تاج محل کا ذہنی سفر طے ہوا تھا۔ یہ اس ملک خود کے ذہن کا ارتقا تھا......

وہ یوں ہی سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے پاس آہٹ معلوم ہوئی اور اکدم [illegible]

کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ دونوں مڑ کر تاج محل کو دیکھنے لگے۔ شام ہو گئی تھی۔ دھندلکے میں تاج محل ایسا معلوم ہوا جیسے کسی حسین چہرہ پر افسردگی چھا جائے۔ مگر کچھ ہی دیر بعد تاج محل ایک عجیب طرز سے چمک اٹھا۔ آسمان پر چاند نکل آیا تھا اور تاج محل زمین پر ماہ کامل نظر آ رہا تھا۔ سنگ مرمر چاندنی کی روشنی اور فن کی اعلیٰ شکل عجیب روحانیت کی اداکاری کر رہے تھے۔ مسلم اور چمپا اس روشنی میں نہائے ہوئے تھے اور اس روشنی میں محو تھے۔ وہ دونوں بھی تاج محل کے فنی آہنگ کا ایک حصہ ہو گئے تھے۔ اس کی زندگی ان کی زندگی ایک تھی۔ دونوں کو قدرت نے قطب الدین ایبک کے دور میں ایک کیا تھا۔ مگر آج قدرت کے ساتھ ساتھ فنی کمال بھی ان کو ایک کر رہا تھا۔ وہ اب تک اپنے عروج کمال پر پہنچے ہوئے تھے جس میں قدرت اور فن دونوں اپنا پورا پورا روحانی اثر دکھا رہے تھے۔ ان کی زندگی ایک حقیقت بھی تھی اور طلسم بھی۔ رات بھر وہ دونوں اس حقیقی طلسم میں گم رہے۔

مگر صبح ہوتے ہی یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ دن چڑھے وہ قلعہ میں واپس آ گئے۔ جہاں اورنگ زیب نے بادشاہ بیگم کا خطاب دیا تھا۔ وہ دلی جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ پرویز بھی ساتھ جانے کی۔ مسلم بھی اورنگ زیب کے مصاحبین میں شامل ہو جائے گا۔

اورنگ زیب کی مصاحبت نے مسلم پر بڑا اثر کیا۔ اورنگ زیب عجیب چیز نظر آیا۔ ناصر الدین شاہ کی طرح سادہ اور پاکباز تھا۔ ٹوپیاں کاڑھ کر اور قرآن شریف لکھ کر اپنا خرچ کرتا [illegible] وہ [illegible] ایک نئی صورت کا اشارہ تھا۔ سپاہی مسلمان [illegible] سخت۔ فنون کا دشمن اور فقیہوں کا دوست۔ وہ اسلام کو عقلی اور ذہنی سطح پر [illegible] آیا تھا۔ [illegible] اور فکر جس کی دنیا اکبر نے [illegible] وہ اورنگ زیب کی ہستی میں [illegible] ہوئی تھی یعنی مذہب سخت اور بااصول ہو گیا تھا مگر تنگ نظر بھی ہو گیا تھا۔ مذہب کے قوانین سے آزادی کا [illegible] کفار سے رواداری ختم ہو گئی تھی۔ اسلام کے دوسرے فرقوں سے بھی [illegible] مناسب نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مگر پھر بھی اورنگ زیب سب سے زیادہ [illegible]

تم نے اس کی طرف توجہ ہی [illegible]

ہیں یہ لوگ۔"

"مگر ہم اور تم تو ایک ہیں۔ اور ہمارے تمہارے ایسے لوگ بہت ہیں۔ اکبر نے جس چیز کی بنیاد رکھی تھی وہ جڑیں پکڑے ہوئے ہے۔"

"یہی تمھاری غلطی ہے۔ وہ بنیاد مستحکم نہیں ہے میں یہی دیکھ رہا ہوں۔"

کچھ دیر سوچ کر مسلم نے کہا۔ "دیکھنا ہے شاید تم ہی سچ کہتے ہو۔"

دونوں اکثر اسی مقام پر آکر بیٹھ جاتے اور اسی طرح باتیں کرتے رہتے۔ آخر ایک دن جسونت سنگھ کی موت کی خبر آئی۔ اس کے کچھ ہی دن بعد اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کے نو برس کے لڑکے اجیت کو بلوا بھیجا۔ قلعے میں خبر مشہور ہو گئی کہ اورنگ زیب اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے اور مسلمان کرے گا۔ راجپوت سب بگڑ کھڑے ہوئے۔ [illegible] راجہ [illegible] سے فرار ہوا۔ مسلم سے کہتا گیا۔ "دیکھا تم نے میں نے جو کہا تھا وہی ہوا کہ نہیں۔"

اورنگ زیب نے راجپوتوں سے جنگ کا اعلان کر دیا۔ مسلم اس کے ساتھ جنگ پر گیا۔ کچھ دنوں جنگ کے بعد صلح ہو گئی مگر مسلم کو محسوس ہوا کہ مغل حکومت کی بنیاد ہل گئی اب اس عمارت کا گرنا لازمی ہو گیا۔ اورنگ زیب بھی خوب سمجھ گیا تھا کہ خیریت نہیں ہے۔ ہر طرف فساد ہونے لگے تھے۔ پریشانی سے بچنے کے لیے اس نے دکن کو فتح کرنے کی ٹھانی۔ سپاہی سپاہی کا بچہ میدان میں اپنی جان دے دینا چاہتا تھا۔ مسلم کو اس کا ہمرکاب ہونا پڑا۔

مغل فوج اب شہر کا شہر تھی۔ جہاں پڑاؤ ڈالتی ایک پورا شہر آباد ہو جاتا۔ بازار لگ جاتیں ہر قسم کی تفریحات ہونے لگتیں۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے قلعے اس فوج کے لیے کچھ نہ تھے۔ اورنگ زیب پہاڑی پر نماز پڑھتا رہا۔ فوج نے دم کے دم میں قلعوں کی فصیلیں توڑ ڈالیں۔ مسلم کو محسوس ہوا کہ سپاہی گری کا زمانہ پھر واپس آگیا۔ مگر بیجاپور اور گولکنڈہ کے ختم ہوتے ہی ایک نئی قوم سے مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ شیواجی کی قوم تھی۔ شیواجی کا دلّی کی قید سے بھاگنا ایک

پڑا [illegible] ہو چکا تھا۔ شیواجی نے اورنگ زیب سے صلح کر لی تھی۔ مگر اب پوری مرہٹہ قوم جو بیجاپور اور گولکنڈہ سے وابستہ تھی بیکار ہو گئی تھی اور مغل فوج کو پریشان کرنے پر تلی تھی۔

اس قوم کے لڑنے کا عجیب طریقہ تھا۔ یہ فوج کے سامنے کبھی نہ آتی بلکہ ڈاکوؤں کی طرح حملے کرتی۔ مغل فوج پیچھا کرتی تو پہاڑوں کی کھوہوں میں چھپ جاتی۔ اورنگ زیب تنگ آکر کہتا "پہاڑی چوہے پہاڑی چوہے ہم شیروں سے لڑنے والوں کو چوہوں سے واسطہ پڑا ہے چوہوں سے کیسے لڑیں۔"

ایک دن اورنگ زیب نے سیکڑوں کی تعداد میں بدمست گھوڑے خریدے۔ حکیموں کو جمع کر کے ان کو نہایت گرم دوائیں پلوائیں اور انھیں فوج کے خیموں کے چاروں طرف بندھوا دیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا کیا مقصد ہے۔ اس روز شاہی حکم جاری ہوا کہ سب سپاہی آرام سے سوئیں۔ رات کو سب سپاہی سو رہے تھے۔ مسلم خیمہ گاہ سے الگ ٹہل رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ مرہٹوں کا ایک غول خیمہ گاہ کی طرف آیا۔ گھوڑے اپنے کھونٹوں پر بیتاب ہو کر رسیاں تڑانے لگے۔ غول ان کے پاس پہنچا ہی تھا کہ سب گھوڑے مرہٹوں پر ٹوٹتے نظر آئے۔ مرہٹے سب گھوڑیوں پر سوار آیا کرتے تھے۔ یہ بدمست گھوڑے ان کے پیچھے لگے۔ سواروں کو گرا دیا۔ مرہٹوں کا غول دم کے دم میں بھاگتا نظر آیا۔ گھوڑے ان کا پیچھا کرتے دکھائی دیتے۔ خیمے سے جو سب سے اونچا تھا ہنسی کی آواز بلند ہوئی۔ مسلم وہاں پہنچا۔ بادشاہ ہنسی کے مارے لوٹا جا رہا تھا۔ پورے خیمہ گاہ میں یہ خبر پہنچ گئی۔ تمام فوج ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ گئی۔ مرہٹوں کے بھگانے کی بڑی لطیف تدبیر تھی۔ مرہٹوں کی گھوڑیوں کی اچھی گت بنی۔ مرہٹے بھی بے بس ہو گئے۔

اورنگ زیب نے اب مرہٹوں کے قلعوں کو فتح کرنے کا تہیہ کر لیا۔ فوج بڑھتی چلی گئی۔ قلعوں پر قلعے فتح ہوتے گئے۔ مغل فوج دور سمندر تک پہنچ گئی۔ راس کماری سے لے کر [illegible] تک کا ملک مغل حکومت میں آ گیا۔ اتنی بڑی عملداری کسی بادشاہ کی نہ ہوئی تھی۔ اورنگ زیب

Scanned with CamScanner

دلی واپس ہوا۔ تو ستاسی برس کا بڈھا پچیس برس تک گھوڑے کی پیٹھ سے نہ اترا تھا۔ آبرو کی طاقت اور اکبر کا عزم اس میں عروج و کمال پر پہنچ کر ختم ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ مسلم اس کی جھکی کمر کو دیکھتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ مغل حکومت کی موت قریب آ ہی گئی ہے! اورنگ آباد پہنچ کر فوج نے پڑاؤ ڈالا۔

اورنگ زیب لکڑی ٹیکتا ہوا آگے آگے اور مسلم پیچھے پیچھے تالاب کے پاس ہیرا بائی کی قبر پر پہنچے۔ قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد اورنگ زیب کانپنے لگا۔ مسلم سے بولا "میرے قوا جواب دے رہے ہیں میں اب اپنی ہیرا بائی سے جا ملوں گا۔ مسلم وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ تمہیں یاد ہے؟"

مسلم نے اسے سنبھالا۔ خیمہ میں لا دیا۔ اس نے اپنے لڑکے معظم کو خط لکھوایا۔ خط کا آخری جملہ تھا۔ "از ماست ہمہ فساد باقی"۔ اس جملے کو وہ بار بار دہراتا رہا۔ "از ماست ہمہ فساد باقی از ماست ہمہ فساد باقی"

مسلم سوچتا رہا کہ اس جملے میں اورنگ زیب کی حکومت کے مکمل معنی آ گئے ہیں۔ پھر اورنگ زیب نے ہدایت کی کہ فلاں مہری کے پاس جو روپے جمع ہیں ان سے اس کی تجہیز و تکفین ہو۔ مسلم اٹھ کر اس مہری کے پاس گیا روپے لایا اور ایک خط بھی لایا۔ اسی اثنا میں بادشاہ دم توڑ چکا تھا۔ سر بہ مہر خط کو توڑا گیا۔ اس میں لکھا تھا "میری تجہیز و تکفین حضرت مذہب شیعہ کے مطابق ہو۔"

مسلم کے ہاتھ سے خط زمین پر گرا۔ وہ پاگل ہو کر خیمہ سے باہر بھاگا!

۳

لال قلعہ میں بادشاہ بیگم جہاں آرا کی حالت بہت خراب تھی۔ دو چار گھنٹے کی مہمان تھی۔ پروین پاس بیٹھی تھی سامنے زیب النساء کھڑی رو رہی تھی۔

"پروین خانم" شہزادی کی نحیف آواز آئی "میری زندگی بھی کیا زندگی تھی۔ نہ گھر بسا۔ جوانی میں باپ قید ہوئے۔ آٹھ برس میں بھی قید میں رہی۔ اب بادشاہ ہوئی۔ عالمگیر بھائی جان ایسے میرا کوئی نہ رہا۔ کوئی نہ تھا۔"

"حضور عالی جاہ۔ آپ بھی اپنے بھائی کی طرح خدا پرست ہیں۔ آپ کا قرب اللہ والی ہیں۔ آپ ولی اللہ ہیں۔"

خیر جو کچھ ہوا۔ جو کچھ خدا کو منظور تھا ہوا۔ قندھار کی فتح پر جو جشن منایا گیا میرے جسم میں آگ لگ گئی تھی کاش اسی وقت میں مر جاتی۔ بھائی دارا جیسے ... تھے۔ سپہر شکوہ کو میں نے بیٹا کیا تھا وہ بھی نہ رہا۔ خیر خانم تم مجھے محبوب الٰہی کی درگاہ میں ایک کونے میں دفن کرانا۔ میری قبر پر کوئی سایہ نہ ہو اور قبر کچی ہے اور ... اس پر یہ شعر لکھوانا ۔

یوں ہی باتیں کرتے کرتے محل خانے کا ذکر آتا۔ پھر زیب النسا کا ذکر کرتی جو مخفی تخلص کرتی تھی اور دیوان جمع کر چکی تھی۔

"مغل خاندان کی عورتیں بھی ایک سے ایک سخن ور اور سخن شناس گزری ہیں۔"

"مگر پھوپی کہتی تھیں ان سب کی زندگیاں برباد گئیں کسی کی شادی نہ ہو سکی۔ سب کنواری رہیں مخفی نے بھی کہہ دیا ہے کہ یہ شعر میری قبر پر لکھوا دینا ـــ

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے

نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

بیچاری ..... کیا کہوں کیا درد ہے ..... وہی بات جو جہاں آرا کے ساتھ تھی۔

اورنگ زیب نے تو راگ اور گانا بند کرا دیا تھا۔ مگر اس کے مرتے ہی محلات میں ان فنون کی شدت نظر آئی۔ بادشاہ زیادہ سے زیادہ ان میں دلچسپی لینے لگے۔ پھوپی کی اب حیثیت ایسی نہ تھی کہ وہ خود اچھی یا گاتی مگر جیسے وہ محل کی خاص خادم تھی شہزادیوں کی اتالیق تھی ویسے ہی ان فنون کو سب سے بڑی نباض بھی تھی۔ تان سین وغیرہ کے ایجاد کردہ راگوں کا رس وہی تھی اور ناچنے گانے والیوں کا ایک گروہ اسی سے تعلیم لیتا تھا۔ موسیقی زیادہ تر عورتوں کا فن ہوتا جا رہا تھا۔

علم و ادب کے علاوہ مصوری نے بھی مرعوب کیا تھا۔ اکبر کے کتاب خانے میں جتنی مثنویاں قلمی موجود تھیں ان میں نہایت عمدہ تصویریں بھی شامل تھیں۔ ان تصویروں کو وہ دیکھا کرتی۔ پھر جہانگیر، شاہجہاں کے دور کے مراسم و مرتبے کی تصویریں دیکھی۔ اورنگ زیب کے مذہبی نے تصویری کو مردود قرار دیا تھا مگر اس کے دور کی بہت سی تصویریں بنائی جا چکی تھیں۔ جہانگیر کے دور کی تصویریں سب سے بہتر تھیں مغل مصوری بھی ایک خاص چیز تھی۔ جہانگیر نے اسے سب سے زیادہ عروج دیا تھا جتنی بھی تصاویر ہیں ان تصویروں میں موجود ہیں ان کو ترتیب میں لا کر پھر سے مغل دور کی تاریخ سامنے آ جاتی تھی۔

وہ فن عمارت میں بھی دلچسپی لیتا اور اکثر پرانی عمارات کو دیکھنے جاتا۔ اس نے ان سب کے حالات لکھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ نادر شاہ درانی کے حملے کی خبر آئی۔ دلی میں ہلچل مچ گئی۔ مسلم کے دل میں ایک نیا جوش پیدا ہوا۔ پھر ایک سپاہی ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت کو زندہ کرنے کے لئے آ رہا تھا۔ وہ چاہنے لگا کہ اس سپاہی کے ساتھ ہو جائے۔ تیمور کی طرح یہ بھی گڈریہ تھا۔ وہ منگولیہ سے آیا تھا۔ یہ ایران سے آ رہا تھا۔

نادر شاہ کی فوج دلی میں داخل ہو گئی۔ نادر فتحپوری مسجد کے پھاٹک کھڑا ہوا اور اپنی تلوار کو نیام سے نکال لیا۔ اس کے سپاہی بزن بزن کہتے ہوئے لوٹ مار کرنے لگے۔ محمد شاہ کو خبر پہنچی وہ سہم گیا۔ مسلم نے سوچا کہ تیمور کے خون کی اب یہ حالت ہو گئی تھی اور یہ بہت افسردہ ہوا۔ آخر کو خزانوں میں جواہرات لگانے گئے۔ امرا رومال سے ہاتھ باندھے ہوئے ننگے سر چلے چاندنی چوک کی سڑک پر آ گئے۔ سب زور زور سے یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی

دگر بزندہ کنی خلق را و باز کشی

یہ جلوس نادر کے پاس پہنچا۔ اس نے شعر سنتے ہی نیام میں تلوار رکھ لی۔ اس کی فوج نے کشت و خون بند کر دیا۔ نادر گھوڑے پر سوار ہو کر لال قلعہ کی طرف چلا۔ خاص پھاٹک پر ایک نازک بدن، لطیف شاہانہ لباس میں استقبال کے لئے منتظر نظر آیا۔ نادر اپنے گھوڑے پر سے کود کر اس کو لپٹ گیا۔ اس نے بڑی زور سے آہ بھری اور بے ہوش ہو گیا۔ نازک بادشاہ اس سپاہی کے لپٹنے کی تاب نہ لا سکا۔ طبیب جمع ہوئے۔ الامان۔ الامان کا غلغلہ بلند ہوا۔ مسلم کو یہ سماں دیکھ کر بڑا افسوس ہوا۔

نادر قلعہ میں ٹھہرا۔ دسترخوان پر نفیس کھانے چنے گئے۔ اسے اس قدر اچھے لگے کہ بے تحاشا کھا گیا۔ پیٹ میں درد اٹھا۔ طبیب بلائے گئے ایک زبان سے [illegible] درد سر [illegible] نے ہوئے پاس آئے نبض دیکھنے کے بعد غور کرنے لگے [illegible] [illegible]

اور وہ انگلیوں سے نکال نکال کر کھانے لگا۔ مرتبان ختم کر کے بولا "حلوہ خوب است دیگر بیارید"
ایک شام کو اس نے شہر کی سیر کا ارادہ ظاہر کیا۔ شاہی ہاتھی لایا گیا۔ وہ سیڑھی لگا کر اس پر چڑھا اور فیل بان سے بولا "لگامش را بدہ"۔ اسے سمجھایا گیا کہ اس جانور کو لگام سے نہیں چلایا جاتا بلکہ فیلبان چلاتا ہے وہ یہ کہکر "من ایں مرکب را سوار نمی شوم کہ لگامش در دست دیگر است" ہاتھی پر سے کود پڑا۔

مسلم یہ سماں دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت متاثر ہوا "یہ گدڑیہ ہمیشہ اپنے گھوڑے کی لگام اپنے ہی ہاتھ میں لئے رہا۔ یہ کیسے ایسی سواری پر بیٹھ سکتا تھا جس کی لگام اس کے خود کے ہاتھ میں نہ ہو۔ خود اعتمادی کی حد تھی۔ اف۔ اف" مسلم کو یقین ہوا کہ اب نادر شاہ کا خاندان ہندوستان پر حکومت کرے گا۔ مگر نہیں نادر شاہ تیمور کی طرح آیا تھا۔ زر کثیر لے کر اور تخت طاؤس لے کر واپس گیا۔ ہندوستان کو فقیر کر گیا۔ مغل حکومت کے اقبال کو ختم کر گیا۔

محمد شاہ اور بھی زیادہ رنگیلا ہو گیا۔ عورتیں۔ نلچ رنگ میں محو رہتا۔ ہر عورت پر عاشق ہو جاتا۔ سونے کے ٹاپے بنوائے تھے۔ ان میں ننگی عورتیں بند ہوتیں یہ ٹاپوں کے پاس جا کر مرغے کی طرح پر جھاڑتا۔ بانگ لگاتا۔ ٹاپا اٹھا کر اندر ہو جاتا۔ پروین یہ سماں دیکھتی۔ وہ قاحبہ چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ مسلم بھی گھر واپس ہونے کو بے قرار تھا۔ آخر ایک دن محمد شاہ نے پروین کو آنکھ بھر کر دیکھا۔ فوراً اظہار عشق کرنا شروع کر دیا۔ پروین ناراض ہوئی۔ وہ چمٹ گیا۔ پروین نے دھکا دیا۔ وہ چت گرا۔ پروین بھاگی۔ وہ چیختا رہا۔ کسی نے ایک نہ سنی۔ اکبر کی یہ اولاد اب اس ذرہ ہم پر آگئی تھی کہ ایک عورت کے دھکے سے گر گئی اور اس کا اقبال اب اس پستی پر تھا کہ اس کے ملازم بھی اس کا حکم نہ سنتے تھے۔ پروین مسلم کے پاس آئی۔ دونوں فوراً گھوڑوں پر سوار ہو کر اودھ روانہ ہو گئے۔ ان کے گھر پہنچتے پہنچتے ہی ہندوستان کا شیرازہ بکھر گیا۔ ہر صوبہ الگ ہو گیا۔

مسلم اب نواب صاحب کہلانے لگا۔ اس نے اپنے محل میں بڑا نوابی ٹھاٹھ جما لیا۔ ہر کام کے لئے ایک داروغہ اور اس کے نیچے متعدد خدمت گار رکھے۔ ایک شاعر، ایک بزلہ گو،

ایک مولوی، ایک ٹھاکر، ایک کاتستھ، ایک مہاجن صاحب اس کے خاص مصاحب اور عہدے دار مقرر ہوئے۔ وہ صبح نماز کے وقت اٹھتا۔ نماز سے فارغ ہو کر دیوان خانے میں مسند پر آ بیٹھتا۔ لوگ آتے جاتے۔ معاملات اور حساب کی باتیں ہوتیں۔ شعر و شاعری کا چرچا رہتا۔ پھر دسترخوان بچھتا۔ ہر قسم کے لذیذ کھانے چنے جاتے۔ پچاس ساٹھ آدمی ساتھ بیٹھتے۔ اس کے بعد آرام کرتا۔ سہ پہر کو اٹھ کر باغ میں آتا۔ متعدد قسم کی تفریحات بہم پہنچائی جاتیں۔ کبھی ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کی سیر کو جاتا۔ کبھی شکار کی طرف نکل جاتا۔ ناؤ پر سیر کرتا۔ محل کے اندر آتا۔ یہاں بیگم صاحبہ نے وہ سب ٹھاٹھ جما رکھے تھے جس کی وہ قلعہ میں خانم کی حیثیت سے مشق کر چکی تھی۔ اکثر رات کا کھانا محل کے اندر ہی ہوتا۔ اس کے بعد آرام گاہ میں بیگم صاحب کے ساتھ چلا جاتا۔

دونوں کے اعلیٰ مذاق نے محل کو جنت بنا رکھا تھا۔ پردے، قناتیں، شامیانے ہر جگہ لگے ہوئے تھے۔ بارہ دریاں جھاڑوں اور فانوسوں سے سجی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر عمدہ عمدہ تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ فرش پر دریاں، پر بیش قیمت قالین بچھے نظر آتے تھے۔ پروین شہزادیوں کا لباس پہنتی اور گہنے میں لدی رہتی۔ مسلم ہاتھوں میں انگوٹھیاں پہنے رہتا۔ گلے میں جواہرات کا ہار ڈال لیتا اور سر پر کامدار ٹوپی پہنتا۔ دونوں کو اب کامل آرام اور اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔

ان کی زندگی عجیب سکوت میں آگئی تھی۔ دلی کی بادشاہت کا کوئی خیال بھی کبھی نہ آتا۔ باہر سے حملے کی کوئی امید نہ باقی رہ گئی تھی۔ اس کی زبان بالکل ہندوستانی ہو گئی تھی۔ اس کے ملازم اس کو کسی قسم کی فکر میں نہ پڑنے دیتے۔ وہ پان کھانے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ حقہ پیا کرتا تھا۔ وہ زیادہ تر رومی کا یہ شعر پڑھا کرتا۔

کارساز ما بفکر کار ما
فکر ما در کار ما آزار ما

اسی عالم میں ایک دن اس کے کاکستھ مصاحب نے ایک شعر سنایا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

وہ بہت متاثر ہوا اور پوچھنے لگا "یہ کس کا شعر ہے؟"

"یہ برہمن کا شعر ہے۔ سراج الدولہ کے دیوان کا۔ اس نے سراج الدولہ پر یہ شعر کہا۔ پلاسی کی لڑائی کے بعد۔"

"پلاسی کی لڑائی بھی عجیب چیز تھی بھئی۔ ان فرنگی سوداگروں نے بہار اور بنگال کے نواب کو دم کے دم میں مار بھگایا۔"

"سرکار، وہ میر جعفر انگریزوں سے مل گیا۔ لڑائی کیا ہوئی کچھ نہیں۔ سراج الدولہ کی سب فوج میر جعفر کے ماتحت تھی۔ جنگ شروع ہوئی تو وہ فوج لڑی ہی نہیں۔ انگریزوں کے ساتھ ایک تلپ رائے تھا اس کی فوج نے حملہ کیا۔ سراج الدولہ کے چند سپاہی تھے وہ بھاگ گئے۔ سراج الدولہ بھی بھاگ نکلا نہ معلوم کہاں گیا۔ برہمن یہ شعر پڑھتا پھرتا ہے ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

مگر بات رفع دفع ہو گئی۔ اس لڑائی کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی گئی۔ سراج الدولہ سے کوئی ہمدردی کا اظہار بھی نہ کیا گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ شاہ عالم اور شجاع الدولہ میر قاسم کی مدد ہی فرنگیوں کے خلاف مدد کرنے کیلئے فوج لئے جا رہے ہیں۔ مسلم کو خیال ہوا کہ وہ بھی اس فوج کے ساتھ جائے مگر اس کے مصاحبین نے منع کر دیا۔ "حضور کیوں ان لغویات میں پڑیں۔"

حقہ کا دھواں منہ سے نکالتے ہوئے مستقیم نے کہا۔

"ما زچہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت۔"

اس کے بعد شاہ عالم نے کمپنی کے مالک تکا ٹیکو بنگال اور بہار کی دیوانی بخش دی اور شاہ عالم الٰہ آباد کے قلعہ میں لا کر رکھا گیا۔ اب مسلم کی امارت میں فرق آیا۔ مگر وہ اپنے گھر میں بیٹھا رہا۔ وہ اب شجاع الدولہ کی عملداری میں آ گیا۔ پھر آصف الدولہ نے یہ اضلاع انگریزی فوج کے خرچے کے بدلے میں دے دیئے۔ مسلم کو اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا۔ جائداد سب کمپنی کی ہو گئی۔ جواہرات اور بیگم کو لے کر وہ پہلے دلی میں آیا۔

یہاں قلعہ خالی ہو چکا تھا شہر ہر وقت مرہٹوں کی لوٹ مار کے ڈر سے تھرایا کرتا تھا مگر ایک نئی زبان وجود میں آ گئی تھی جس کو ہندی کے بجائے ریختہ کہا جاتا تھا۔ ولی دکن سے آ کر محمد شاہ کے عہد میں ستارہ ہو کر چمک چکے تھے اور اب آفتاب ہو کر اوج پہ آئے تھے۔ ان کی غزلیں مسلم تک پہنچیں اور اس نے انھیں اس ذخیرے میں شامل کر لیا جو وہ جمع کر رہا تھا۔ ان غزلوں کو پڑھ کر وہ محسوس کرتا کہ فارسی غزل گوئی کا رنگ ہندوستانی زبان میں خوب اتارا گیا ہے۔ ولی کی ایک غزل کے یہ اشعار اسے بہت ہی پسند آئے۔

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا — جادو ہیں ترے نین غزالاں سے کہوں گا
دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی — یہ کشور ایراں میں سلیماں سے کہوں گا
زخمی کیا ہے مجھ تری پلکوں کی انی نے — یہ زخم ترا خنجر بھالاں سے کہوں گا

دلی میں گھر گھر شاعری کا چرچا تھا۔ جس امیر اور جس شریف کو دیکھو شعر کی سوچ میں غرق بیٹھا تھا۔

مگر یہ عالم کچھ ہی عرصے تک رہا۔ دلی اجڑنے لگی۔ صاحب کمال یہاں سے ہٹ ہٹ کر لکھنؤ جانے لگے۔ اس پریشانی کے عالم میں ریختہ کی شاعری اور بھی ترقی کرتی نظر آئی۔ پریشانیوں نے تصوف کی ایک لہر دوڑا دی تھی اور پیری مریدی کی فضا دلی پہ پھر غالب آ رہی تھی۔ دلی کے صوفیہ میں خواجہ میر درد کا خاندان بہت معزز تھا۔ خواجہ میر درد شاعر کی حیثیت سے بھی بہت مشہور و مقبول ہوئے۔ مسلم ان کی درگاہ میں گیا۔ وہ نہایت خلوص سے پیش آئے اور اپنی یہ غزل سنائی ؎

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے / جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے / ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا / ایک دم آئے ادھر اودھر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں / چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ / جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

میر درد ہی سے اسے میر سوز، مرزا سودا اور میر تقی میر کے حالات معلوم ہوئے۔ میر سوز لکھنؤ چلے گئے تھے۔ مگر مرزا سودا کو لکھنؤ سے بلاوا آیا تھا تو انھوں نے یہ رباعی لکھ کر بھیج دی تھی۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک / آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے / بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

سودا بڑے ہی مغرور شاعر مشہور تھے۔ شاہ عالم کے استاد رہ چکے تھے مگر ایک بات پر دربار سے بالکل الگ ہو گئے تھے۔ کابلی دروازے میں ان کا گھر تھا۔ مسلم ان کے یہاں پہنچا۔ ان کو عجیب شاعر پایا۔ وہ ہر صنف میں کمال رکھتے تھے۔ کافی تعداد میں قصیدے موجود تھے جو خاقانی اور انوری کے قصیدوں سے ٹکر لیتے تھے۔ ایک قصیدہ حضرت علی کی شان میں عرفی کے طرز میں تھا۔ مطلع تھا ۔

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

مسلم نے انھیں اپنے مکان پر مدعو کیا۔ وہ آئے اور اپنی کئی غزلیں سنائیں۔ ایک غزل مسلم کو بہت پسند آئی۔ مطلع تھا۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اس نے سودا کی کافی غزلیں جمع کر لیں مگر جب وہ ان پر غور کرتا تو اسے محسوس ہوتا کہ ان میں غزل کی وہ روح نہیں ہے جو غزل کی ہونا چاہیے۔ الفاظ میں بھی نرمی کے بجائے شکوہ نظر آتا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد سودا فرخ آباد چلے گئے۔

مسلم کے پاس شہر کے اکثر لوگ آتے اور زیادہ تر شعر و شاعری ہی کی باتیں کرتے۔ میر اور سودا کو سب مسلّم استاد مانتے تھے مگر یہ کہتے کہ سودا کا کلام "واہ" ہے اور میر کا "آہ"۔ سودا کی ہجویں بھی مشہور ہو گئیں۔۔۔ یہ ہجویں بہت ہی پست تھیں مگر کافی تعداد میں طنز و مزاح کے بڑے اچھے شعر نظر آتے۔ سودا نے ایک نظم کہی تھی جس کو شہر آشوب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ شاعری میں بہت ہی بڑی جدت تھی۔ مسلم کو سودا کے تمام کلام میں یہی سب سے زیادہ پسند تھی۔ بہت سے بند اسے یاد تھے اور انھیں وہ اکثر پڑھا کرتا تھا۔

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواں ڈول / پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں دو بول / جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیروں یا تول

میر محمد تقی کی غزلیں اکثر لوگوں نے اسے آکر سنائیں۔ ان کو اس نے سب سے بہتر مانا۔ یہ غزل اسے اس قدر بھائی کہ اس پر وہ اکثر سر دھنتا۔

ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا / پیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا
پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں / معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ پڑا / یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر / میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

وہ میر صاحب سے ملنے کا خواہاں ہوا مگر میر صاحب کے بابت لوگوں نے کہا۔

تو جس مکان میں رہتے ہیں اس کے پائیں باغ کا دروازہ کھول کر آج تک انہوں نے نہیں دیکھا کوئی جائے تو ڈانٹ کر بھگا دیتے ہیں۔ بات کرنا چاہے تو کہتے ہیں "تم سے بات کر کے اپنی زبان خراب کروں" شعر سننے کی التجا کرے تو کہتے ہیں "تم میرے شعر کیا سمجھو گے" مسلم نے ان سے ملنے کی کوشش نہ کی۔ دلی کے روساء میں سے بھی بہت سے لکھنؤ جانے لگے۔ بڑی بن بیگم کے پاس جو بیگمات آتی تھیں وہ حالات سے بہت ڈراتی تھیں۔ اس نے زور دیا کہ جب گھر سے دور ہی رہنا ہے تو دلی کے بجائے لکھنؤ چل کر کیوں نہ رہا جائے۔ چنانچہ مسلم لکھنؤ روانہ ہوا۔ یہاں آکر اس نے ایک عالیشان مکان بنوایا۔ بادشاہ کے مخصوص مصاحبوں میں ہو گیا اور راجہ مسلم علی خاں کہلانے لگا۔

اس نے ایک روز مشاعرہ کیا۔ اس میں شاعر جمع ہو رہے تھے کہ ایک لاغر تن نحیف اندام، گندمی رنگ صاحب تشریف لائے۔ یک کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کا جامہ پہنے تھے۔ ایک چوڑا تھان پستولیے کا کمر سے بندھا تھا۔ ایک رومال پٹی دار تہہ کیا ہوا اس میں آویزاں تھا۔ مشروع کا پاجامہ جس کے عرض کے پائنچے تھے۔ ناگ پھنی کی انی دار جوتی جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک تھی۔ کمر میں ایک طرف سیف اور دوسری طرف کٹار بندھی تھی۔ ان کو دیکھ کر لکھنؤ کے بانکے ہنسنے لگے۔

وہ دل تنگ ہو کر بیٹھ گئے۔ لوگوں نے ان سے بات کرنا چاہی تو تیور بدلنے لگے اور جواب نہ دیا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ ان صاحب کو الجھن ہونے لگی۔ سامنے آئے اور چپکے یہ شعر پڑھے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلی جو ایک شہر تھا دنیا میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

جس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

پورا مشاعرہ متوجہ ہو گیا۔ آخر میں مقطع کے شعر میں میر تخلص آیا۔۔۔ پورا مشاعرہ سکتے کے عالم میں آ گیا۔۔۔۔ مسلم پر عجیب عالم طاری ہوا۔۔۔۔ میر صاحب اٹھ کر چل دیئے۔۔۔۔ کہاں گئے؟۔۔۔۔ کہاں پہنچے؟۔۔۔۔ نواب آصف الدولہ نے ملازم رکھ لیا۔

حصّہ چہارم

عجب حالات کے گھوڑے.........

(کمپنی بہادر کے نواب غازی الدین حیدر کو بادشاہ کا خطاب عطا کرنے سے لے کر انگریز کے باغیوں کو معافی کے اعلان تک)

Scanned with CamScanner

۱

ایک یکہ چلا جا رہا تھا۔ اس میں ایک ڈھول رکھا ہوا تھا۔ یکے پر ایک آدمی تیغ
ڈنڈی ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ ایک چوراہے پر یکہ رکا۔ وہ آدمی کھڑا ہوا۔ پہلے اس نے
ڈھول کو زور زور سے پیٹا۔ خلق خدا اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ بولا!!۔

" خلق خدا کا

ملک بادشاہ کا

حکم ہے کمپنی بہادر کا

کمپنی بہادر نے ابوالمظفر معز الدین حیدر نواب وزیر اودھ کو بادشاہ کا خطاب عطا
کیا ہے۔ اس کے سلسلے میں تمام شہر جشن منائے گا۔"

اس نے پھر ڈھول کو زور زور سے پیٹا۔ وہ پھر یکے پر بیٹھ گیا۔ یکہ آگے بڑھا۔
ایک بانکے نے تیوری پر بل ڈالے۔ تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا اور "ہونہہ" کہتا ہوا آگے بڑھا۔ سامنے سے ایک اور بانکا آتا دکھائی دیا۔

کیا نام ہے تمہارا؟" پہلے بانکے نے پوچھا

"شیر خان" دوسرے بانکے نے کہا۔ "تمہارا کیا نام ہے؟"

بنا تھا۔

جب مسلم کی سواری شاہی محل پر پہنچی تو سیکڑوں کی تعداد میں راجہ اور دوسرے شہزادے
کی طرف بڑھ چکے تھے۔ نوبت بج رہی تھی۔ چوبدار آواز لگا رہے تھے۔ سلامتیاں رہیں ایک ایک
جاکا کوئی حرکت ملے:

دن کا سکھ پال زنانی ڈیوڑھی کی طرف چلا گیا۔ مسلم کا ہاتھی قطار میں شامل کر دیا گیا
سپاہیوں کا دستہ سواروں کی قطار میں جا ملا۔

جلوس آراستہ ہو گیا۔ اور آگے بڑھتا گیا۔ سب سے آگے ایک انگریز کرنل گھوڑے
پر سوار ننگی سنگینیں ہاتھ میں لئے ہوئے قدم قدم جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے توپیں تھیں جن کو گھوڑے
گھسیٹ رہے تھے۔ پھر نوبت خانہ تھا جس پر بین کی آواز سے۔

"بہر تو ایں محفلِ شاہانہ مبارک باشد"

کی لے نکل رہی تھی۔ اس کے بعد نشان کا بہت بڑا ہاتھی تھا جس پر زرتاری کمخواب کی جھولیں
پڑی ہی تھیں اور ایک آدمی فیل بان کے پیچھے نشان کا جھنڈا لئے بیٹھا تھا۔ اردلیوں کی
قطار، سواروں کے دستے کے بعد دستے۔ ہر دستے کے بعد ایک قسم کا باجہ۔ متعدد قسم کی آرائشیں
وغیرہ کے بعد بادشاہ سلامت کا ہاتھی آتا تھا۔ ہاتھی کے پیروں میں گھنگھرو تھے۔ کمخواب
کی جھولوں کے ساتھ سونے چاندی کی زنجیریں لٹک رہی تھیں جن میں گھنگھرو لگے تھے اور پر
سونے کی عماری رکھی ہوئی تھی جس کی آگے کی کرسی پر بادشاہ سلامت اور انگریز ریزیڈنٹ
بہادر بیٹھے تھے۔ بادشاہ سلامت کے لباس اور جواہرات پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ان کے
پاس جو انگریز بیٹھا تھا وہ سیاہ کپڑے اور سفید ہیٹ پہنے تھا۔ عماری کی پچھلی کرسی پر ایک
آدمی تھا جو ہاتھ میں چتر لئے ہوئے تھا۔ سورج کی روشنی میں یہ چتر جگمگا رہا تھا اور بادشاہ
اس کے سایہ میں تھے۔ پاس ایک صاحب پگڑی باندھے اور بالا ڈون کا لباس پہنے بیٹھے
تھے ان کے سامنے ریزگاری کا ڈھیر تھا۔ وہ مٹھیاں بھر بھر کر بادشاہ کے اوپر سے لٹاتے

جاتے تھے اور ہاتھی کے چاروں طرف شہدے دامن پھیلائے ہوئے چل رہے تھے۔ چوتھے
جا رہے تھے۔ بادشاہ کے ہاتھی کے بعد مہاراجہ نصیب سنگھ رام پور کا ہاتھی تھا جس پر وہ
ہودے میں ہاتھی دار سے بیٹھے تھے اور ایک اور کرسی جڑاؤ کے پیچھے بیٹھا تھا اس کے پیچھے
قطار ہاتھیوں کی چلی آتی تھی جن میں راجہ صاحبان بیٹھے تھے مسلم کا ہاتھی درمیان میں تھا۔

جلوس پورے شہر میں گھومتا ہوا چوک سے گزرا تو مسلم نے دیکھا کہ دکانیں کو سجائے
ہوئے بیٹھی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی سجاوٹ کا ایک ایک حصہ تھیں میری میں ہوم
ہوئے تھیں ان میں قدرتی حسن اور سجاوٹ کا وہ آہنگ نہ تھا جو اس کی گلی میں اسے نظر
آیا تھا۔ مگر یہ تمام ہنگامے کا اشارہ معلوم ہوتی تھیں۔ سب سجاوٹ سب بعض سجاوٹ۔
نواب سے بادشاہ ہو جانے پر کیا مل رہا تھا۔ کچھ نئے بعض خطاب اور کچھ کسی کا دیا ہوا۔
ایک تجار کا جو مرشدوں سے لٹنے کے لئے روپیہ لینا چاہتا تھا۔

بادشاہ محل میں واپس گئے۔ بارہ دری میں تخت ہمایوں پر جلوہ افروز ہوئے۔ تخت
کے پاس کرسی پر انگریز بیٹھا تمام راجہ اور دوسرے شہزادے کرسیوں پر بیٹھے۔ انگریز ریزیڈنٹ
نے کمپنی بہادر کا فرمان پڑھا۔ بادشاہ کے سر پر سونے کا تاج رکھا۔ پھر توپیں چلنے لگیں۔ نوبت
بجنے لگے۔ بادشاہ نے ہر راجہ اور رئیس کو ایک سونے کا تمغہ عطا کیا۔ تمام رسومات میں ظہر کا
وقت ہو گیا۔

بارہ دری کے پاس کے لمبے برآمدے میں دسترخوان بچھا ہندو اور مسلمان راجاؤں
کے لئے الگ الگ انتظامات تھے۔ کھانے کے سلسلے میں بھی نفاست کی حد نظر آتی۔ چاول
اور گوشت سے وہ کھانے تیار کئے گئے تھے کہ سب لوگ ہاتھ چاٹ چاٹ کر کھا رہے تھے۔

بارہ دری کے ایک طرف سکندر باغ تھا اس میں شام کے وقت صاحب ریزیڈنٹ
نے پارٹی دی تھی۔ الگ الگ سبزہ زاروں میں میزیں لگی تھیں اور ان کے چاروں طرف کرسیاں پڑی
تھیں۔ لوگ آتے گئے صاحب ریزیڈنٹ پھاٹک پر کھڑے تھے اور ہر ایک سے ہاتھ ملاتے

Scanned with CamScanner

تھے۔ آخر میں بادشاہ سلامت تشریف لائے وہ اور ریذیڈنٹ ساتھ ساتھ آکر شامیانے کے نیچے بیٹھے۔ بینڈ باجہ بجنے لگا اور چائے پانی شروع ہوا۔ بہترین قسم کی انگریزی مٹھائیاں موجود تھیں مسلم نے بعض مزے لے لے کر کھایا۔

بارہ دری کا ایک حصہ گومتی کی طرف تھا۔ رات میں سب لوگ یہاں آکر برآمدے پر بیٹھے۔ دریا پار آتش بازیاں چھوڑی گئیں لکھنؤ کے آتش بازوں نے اپنے کمال دکھائے تھے۔

جس حصہ میں صبح کو دربار ہوا تھا۔ وہاں اب نہ مین کا فرش تھا اور ناچ کا انتظام ہوا تھا ایک طرف سیکڑوں کی تعداد میں زنانے اور مردانے طائفے جمع تھے۔ صدر مقام پر سونے کے ڈنڈوں کا شامیانہ لگا ہوا تھا۔ بادشاہ سلامت اس میں آکر بیٹھے اور لوگ زمین پر بچھے ہوئے قالینوں پر جلوہ افروز ہوئے۔

پہلے کچھ زنانے طائفوں نے مجرا کیا: ٹھمری۔ تہانا۔ گانا سب ہی کچھ ہوتا رہا مسلم کو اس میں کوئی خاص دلچسپی نہ ہوئی۔ پھر ایک مردانہ طائفہ آیا۔ یہ اس شہر کی تہذیب کا خاص جزو تھا۔ ایک جوان نہایت خوبصورت کشمیری لڑکا پشواز پہنے کاندھوں پر دوپٹہ ڈالے سامنے آیا۔ اس کے پیچھے دو سارنگیے ایک طبلچی ایک مجیرے والا اور پندرہ بھانڈ تھے۔ ایک نہایت درجہ سیاہ بھانڈ دوڑتا ہوا آگے آیا۔ اور "جیوں۔ جیوں۔ پوچ پوچ" کہہ کر رک گیا پھر بولا۔

"قربان جاؤں حضور عجب حالات کے گھوڑے ہیں۔"

پھر اس نے ایک نظم گھوڑے کی تعریف میں پڑھی۔ وہ گھوڑے کی طرح بھاگ گیا۔ کئی اور اسی طرح آئے اور چلے گئے۔ سب یہ ضرور کہتے "عجب حالات کے گھوڑے ہیں۔"

مسلم نے ایک بھانڈ کی بات خاص طور پر سنی۔ وہ کہہ رہا تھا "ایک صاحب گھوڑا بیچ کر گھر آ رہے تھے۔ راستے میں ایک کوڑا بیچتا ہوا آدمی دکھائی دیا۔ انھوں نے کوڑا خرید لیا کہ خدا کبھی گھوڑا دے گا تو کام آئے گا۔"

ایک اور بھانڈ کا قول بھی مسلم کو بہت ہی پسند آیا۔ وہ بولا "ایک صاحب کو گھوڑا بیچ ڈالا تھا تو ایک گھوڑے کی لید باندھ کر گنڈے پر ڈالے پھرتے تھے لوگوں نے پوچھا "یہ کیا" تو بولے "گھوڑا نہ سہی گھوڑے کی بو باس تو دارم"۔

مسلم پھڑک اٹھا۔ یہ فقرہ اسے غازی الدین حیدر کی بادشاہی پہ طنز معلوم ہوا۔ مسلمانوں کی بادشاہت اب اس طرح کی چیز رہ گئی تھی۔

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور بھانڈ نے آکر ایک قصہ سنایا "گھر سے والدے لڑ کر نکلے قبرستان میں ایک ٹوٹی قبر میں جا کر لیٹ رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ بہت خوش ہوئے کہ خدا نے ہماری دعا سن لی آسمان سے ہمارے لئے گھوڑا بھیجا۔ فوراً قبر سے نکل آئے۔ دیکھا ایک انگریز سوار سامنے سے جا رہا ہے۔ وہ بولے "ڈیم یو سوئر" ہم بھاگے۔ اس نے سٹراسٹر دو کوڑے رسید کئے۔ بلبلا کر رہ گئے۔ وہ کان پکڑ کر گھسیٹا ہوا لے چلا۔ ایک جگہ پہنچا جہاں اس کی گھوڑی نے بچہ دیا تھا۔ وہ بولا "اٹھاؤ اس بچے کو" جانا چار اس گھوڑی کے بچے کو کاندھے پر لادا۔ خدا کا شکر کیا "[illegible] شکر ہے میاں۔ مانگا تھا نیچے اور دیا اوپر"۔

اور یہ بھانڈ بھی چل دیا۔ کہتا ہوا "عجب حالات کے گھوڑے ہیں"۔

اسی پر ساز بجنے لگا اور حسین کشمیری لڑکا ناچنے لگا۔ اس نے کئی چیزیں باندھیں۔ پھر ٹھمری، دادرا، سادرا، سب ہی قسم کے گیت گاتا گیا۔ مسلم یہ سب سن رہا تھا۔

کشمیری لڑکا ان سب کے ادا کرنے میں اسے بڑی نزاکت نظر آئی۔ مگر کشمیری کی آواز بہت ہی اچھی تھی بڑی پاٹ دار آواز اور بڑی سریلی۔ آخر کو اس نے منقبت کی ایک غزل گائی۔

غضب کی کاٹ ہے اے مجرئی شمشیر حیدر کی
ذرا پوچھو کہ کیا حالت ہوئی جبریل کے پر کی

مسلم کو عجیب عظمت اور شان کا احساس ہوا۔ پھر کشمیری نے خاص لکھنوی انداز

میں ایک قیامت کی غزل گائی -

مگر اس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے!
الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

گانے کا انداز بہت ہی خاص تھا۔ کشمیری تختِ شاہی کے قریب آکر پہلا مصرع پڑھتا پھر اس کو راگ میں ادا کرتا۔ پھر دوسرا مصرع تیزی سے پڑھتا ہوا الٹے پاؤں ناچتا ہوا چلا جاتا۔ وہ خاموش ہو جاتا، اس کے ساتھی سب مل کر شعر دہراتے اور ساز بڑی تیزی سے بجتا۔ مسلم اس شعر اور اس کو ادا کرنے کے طریقہ میں محو ہو گیا۔ "فریبِ نرگسِ مستانہ" کس قدر معنی خیز تھا۔ مضمون کا انشا اُس کے سامنے تمام تاریخ لے آیا۔ یہ شعر کائنات کی حرکت کی تصویر معلوم ہوا۔ وہ اسی خیال میں اس درجہ محو ہوا کہ ساری محفل اس کے لئے گم ہو گئی۔

اُسی وقت محل کے اندر ڈومنیاں ناچ رہی تھیں۔ ایک نہایت خوش آواز ڈومنی اسی ادا سے یہ شعر گا رہی تھی سے

تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویرِ خیالی روبرو برسوں

پروین کو اس شعر نے اسی قسم کی محویت میں ڈال دیا تھا جس میں مسلم آگیا تھا۔ پروین کی ساری زندگی مسلم کے تصور سے باتیں کرتے گزری تھی۔ مسلم کی تصویر اس کے روبرو رہی تھی۔ یہ تصویر حقیقی نہ تھی ہمیشہ خیالی تصویر تھی۔ بالکل خیالی۔ وہ جب گھر واپس آئی اور اپنی تمام سجاوٹ کو الگ کر کے مسلم کے پاس بیٹھی تو اس نے کہا: "محل میں خواجہ آتش کی غزل سنکر مجھے خیال ہوا کہ تم تصویرِ خیالی ہو۔ محض تصویرِ خیالی۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو!" مسلم نے کہا مگر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "ٹھیک کہہ رہی ہو تم بھی تصویرِ خیالی ہو۔ وہ مطلع ہو گا۔ سے

تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویرِ خیالی روبرو برسوں"

اس میں:

"جب میں نے یہ غزل پہلے سنی تھی تو میں نے تمہیں تصویرِ خیالی تصور کیا تھا۔ سب دنیا عالمِ خیال ہی ہے۔"

"مگر یہاں آنے سے پیشتر ہمیں کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ سب خیال ہی خیال ہے۔"

"محسوس؟" "کیا کبھی تم سوچتا نہ؟" "ہاں نہیں ہوا۔ کیسے ہوتا۔ جس دنیا میں اب تک رہے وہ حقیقت تھی بالکل حقیقت۔ اس کا خیال بھی حقیقت تھا۔ غرض کوئی چیز لاموجود خیال بھی اور حقیقت سے بھی۔ یہاں کی دنیا محض خیال ہے۔ گھوڑے سجے ہیں۔ ہاتھی گھوڑے بیٹھے ہیں۔ سجتے جاتے ہیں۔ عجب حالات کے گھر پڑے ہیں۔ عجب حالات کی ترکیب ہے۔ بلند ہوا۔ ذرا سی کوشش کی اسے سوچو تو تصور سے باتیں کرنے لگو۔ حقیقت غائب ہو چکی تصور سامنے ہے۔ حقیقت بھی تصور معلوم ہونے لگتی ہے رانی۔"

"شاید یہاں آکر تم منطقی بھی ہو گئے ہو۔ مجھے نہیں اچھا لگتا۔"

"بات تم نے ہی شروع کی۔ خیر خواجہ آتش کا اب یہ شعر پڑھا جائے سے

ہوا نہ غنچگی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

کیا سمجھیں رانی؟"

"کپڑوں اور زیوروں نے تھکا دیا۔"

"اس تہذیب پر تھکن طاری ہے۔۔۔ میں سوچتا ہوں کچھ دنوں کے لئے دیہات چلیں۔"

دوسرے دن دونوں دیہات روانہ ہوئے۔ مسلم گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے ساتھ مصاحبین بھی گھوڑوں پر آرہے تھے۔ سب سے پیچھے گھوڑا گاڑی بھی تھی تاکہ جب جی چاہے تو اس میں آکر بیٹھ جائے۔ پالکی میں پروین بہت سے پیدل سپاہی لاٹھی بستے سواروں کی ہمراہی

ہیں ہو رہا نہ ہو چکی تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ ان سے آگے نکل گیا۔ مگر ہر منزل پر وہ ٹھہر جاتا اور پالکی کا انتظار کرتا۔ پھر پالکی پہلے روانہ ہو چکتی۔ جب وہ چلتا۔ دوپہر ہوتے ہوتے سارا جلوس گاؤں میں داخل ہوا۔ سوار سب ایک قطار میں ہو گئے۔ مسلم گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پالکی گاڑی کے پیچھے پیچھے چلی اور پیدل سپاہی اس کے پیچھے قطار باندھے ہوئے آئے۔ گاؤں کے مرد ڈنڈے سنبھالے ہوئے اور عورتیں لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے ہوئے گاؤں کی سڑک پر دورویہ کھڑے نظر آئے۔ سواری گاؤں کے محل میں پہنچ گئی۔ مسلم کے لئے محل کے باغ میں ایک جگہ پر تخت بچھا تھا۔ وہ اس پر آ کر بیٹھ گیا۔ آسامی نذرانے پیش کرتے رہے پھر اس نے انہیں انعامات دیئے۔

محل کے اندر گاؤں بھر کی عورتیں جمع ہوئیں۔ سب رانی کے لئے کچھ نہ کچھ تحفے تحائف لائی تھیں۔ رانی نے یہ بڑی خوشی سے قبول کئے اور انعامات دیئے۔ شام کے وقت مسلم محل کی دوسری منزل کے کشادہ صحن میں آ کر کھڑا ہوا۔ یہاں سے عجیب دلکش فضا دکھائی دیتی تھی۔ ایک پرگوتی ندی اٹھلتی بل کھاتی چلی جا رہی تھی اس پار ہرے کھیتوں کی ایک لکیر آسمان سے ملتی نظر آ رہی تھی۔ اس پار مختلف رنگوں کے کھیت لہلہاتے ہوئے اور جگہ جگہ آم کے باغوں کے جھنڈ ان کے درمیان کھڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اس منظر میں گم ہو گیا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ اور یہ زمین ایک چیز تھے۔

دوسری طرف اسے گاؤں دکھائی دے رہا تھا کچے مکان۔ بیچ میں ایک سڑک اس پر کچھ دکانیں۔ ایک طرف ایک مندر بنا ہوا اور دوسری طرف ایک مسجد۔ گاؤں سے کچھ دور پر ایک گنبد بھی نظر آتا تھا جو پیر بابا کا مزار تھا۔ اس پر عرس ہوتا، میلہ لگتا گاؤں کے ہندو اور مسلمان دونوں اس سے برابر کی عقیدت رکھتے تھے۔

وہ اسی عالم میں تھا کہ راجہ عطا بخش اس سے ملنے آئے۔ یہ صحیح نسل راجپوت تھے مگر مسلمان ہو گئے تھے۔ بزرگ آدمی لمبی سفید داڑھی چڑھی ہوئی۔ لباس بالکل راجپوتوں کا پوٹری دار پائجامہ دوتی والا جوتا مگر عمامہ بندھی ہوئی۔ مسلم نے نہایت ادب کے ساتھ استقبال

کیا۔ دیوان خانہ میں مسند پر پہلے انہیں بٹھایا پھر آپ بیٹھا۔ شام ہو گئی جھاڑ فانوس روشن کر دی گئیں۔ دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے۔

• انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے ہم خوش نہیں ہوئے۔ کیا اسلامی حکومت پھر نہیں آ سکتی؟

• کیسے کہئے۔ نادر شاہ آیا چلا گیا۔ احمد شاہ ابدالی آیا مرہٹوں کو ختم کر کے چلا گیا۔ یہاں کے مسلمان ختم ہو گئے۔ اس ملک کی عجیب صفت ہے جو قوم آئی یہاں کی ہو کر رہ گئی۔ بابر بھی شاید لوٹ جاتا۔ مگر اس نے حکومت قائم کی۔ ہمایوں نے پھر سے اپنے خاندان کے پیر جمائے مگر اب کوئی آتا نہیں معلوم ہوتا۔

• مجھے خوشی ہے کہ آخر کو مرہٹے بھی مسلمانوں کے ہاتھوں ختم ہوئے۔ بڑا کو دم خم رکھا تھا انہوں نے۔

• مگر یہ ختم نہیں ہوئے۔ انگریز نے ان کو ختم کرنے کے لئے ہی غازی الدین حیدر کو کروڑوں روپے کے بدلے بادشاہ کا خطاب دیا ہے۔ یہ انگریز نئی صورت سے آ رہے ہیں۔ مشرق سے نہیں مغرب سے۔ پہاڑوں سے نہیں سمندر سے۔ سمندر والوں کے قابو نے ہی سب کو بے بس کر دیا۔ اورنگ زیب نے انہیں نکال باہر کیا تھا۔ مگر انہوں نے صوبوں کا راستہ کا بوجھ اسے ان کو پھر جگہ دینا پڑی۔ مگر کبھی خیال نہ ہوا کہ یہ تجارت کے سوا اور کچھ بھی کریں گے۔ فرخ سیر نے ان پر تجارتی چنگی معاف کر دی تھی یہ بڑے مالدار بن گئے۔ حیدر علی نے ما تو کہا تھا کہ میں انگریزوں کو نکال سکتا ہوں مگر سمندر کو خشک نہیں کر سکتا۔

• ان کی جمعیت عقل سے ہوتی ہے جنگ سے نہیں۔

• جی ہاں۔ ٹیپو سلطان کو اس کے وزیر نے مل کر ایک دن میں ختم کر دیا۔ ہمارے یہاں جو آپس میں پھوٹ پڑی ہے اس سے یہ بڑا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نظام اور مرہٹوں کو ملا کر ٹیپو کو ختم کر دیا۔ نظام اب ان کے غلام ہو گئے۔ اودھ بھی غلام ہے۔ دلی کے بادشاہ کا پتہ نہیں۔

Scanned with CamScanner

وہ سند حیا کے ساتھ ہر کرنشنی بھی کم بیٹھے رہنا ہے کہ لال قلعہ میں بھوکوں مرتے ہیں۔"

"اور غلام قادر نے ان کی آنکھیں نکال لیں بیٹا۔ (غلام نے محل میں گھس کر شاہزادیوں کو ناچنے کا حکم دیا۔ یہ مسند پر لیٹا رہا وہ ناچتی رہیں۔ یہ تلوار الگ رکھ کر سو گیا۔ وہ پھر بھی ناچتی رہیں۔ یہ اُٹھ کر بولا تیموریوں کے خون کا اثر اب بالکل ختم ہو گیا۔ نہیں تو تم میں سے کوئی اس تلوار سے مجھے ضرور ختم کر دیتی) مجھے یہ واقعہ سن کر بڑا قلق ہوا۔"

"انگریزوں نے مرہٹوں کو ختم بھی کر دیا۔ لارڈ لیک نے شاہ عالم کو قلعہ میں پھٹے ہوئے شامیانے کے نیچے بیٹھا دیکھ کر بہت ترس کھایا اور پھر پنشن جاری کر دی۔"

"ہٹائیے بھی یہ سب باتیں۔ آپ بھی جب مسلم ہوئے جبکہ اسلام کا اقتدار ختم ہو گیا۔"

"پیر بابا نے ہمارے دادا صاحب پر بڑا اثر جمایا تھا۔ مگر وہ پڑھے لکھے زیادہ نہ تھے۔ والد مرحوم تحقیق کرتے رہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اسلام سب سے اچھا دین ہے۔"

"ہم نے ہندوستان میں اسلام پھیلانے کی کوشش ہی نہیں کی۔"

یوں ہی باتیں ہوتی رہیں۔ دسترخوان بچھا۔ دونوں کے مصاحبین بھی آ گئے۔ باتیں اسی موضوع پر ہوتی رہیں۔ عوام کی حالت کے متعلق۔ خراج۔ ہاتھی گھوڑے۔ سب ہی کی بات کچھ نہ کچھ ہو گئی۔ شکار پر آ کر بات ٹوٹی۔ دونوں نے ساتھ شکار پر جانے کے لئے وقت مقرر کر لیا۔

مسلم اپنی رانی کے پاس آیا۔ رانی سادے کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ چھوٹا پاجامہ ریشم کا۔ ساری محرم کرتی اور ململ کا دوپٹہ گلابی رنگا ہوا شانوں پر پڑا تھا۔ بال کنگھی کئے ہوئے کمر کے نیچے تک لٹک رہے تھے۔ ہاتھوں میں چوڑیوں کے سوا کوئی زیور جسم پر نہ تھا۔ فانوس کی روشنی میں چہرہ گندمی معلوم ہو رہا تھا۔ مسکراہٹ عجیب کرشمہ جگا رہی تھی۔

"تم پر سجاوٹ بار معلوم ہوتی ہے۔"

"مگر محلات میں بغیر اس کے جانا اپنی توہین کرانا ہے اور اپنے محل میں بھی ملازم

پیر صاحب فرماتے تھے کہ یہ تو بنی مٹی رہنا ہے۔ یہ دنیا آدمی نہیں دیکھتی زیور دیکھتی ہے۔"

"مگر ہم تو شروع سے روح ہی دیکھتے آ رہے ہیں۔ پھر بھی تم روح ہو۔"

"دیہات میں آ کر مجھے روح ہی ہو جانا چاہئے۔ مجھے شہر میں رہنا نہیں بھاتا۔ یہاں آ کر محسوس ہوتا ہے کہ گھر آ گئے۔"

"مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔"

"اب ہم تم بالکل ایک ہو گئے۔"

"بالکل۔"

اور وہ دونوں ہم آغوش ہو کر ایک ہو جاتے۔

Scanned with CamScanner

۴

واجد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ نہایت خوبصورت تندرست جوان تھے۔ صبح اٹھتے ہی نماز ادا کرتے اور فوجی کپڑے پہن کر فوج کے میدان میں آجاتے۔ دن چڑھے تک قواعد کراتے۔ تھک کر چور ہو جاتے اور سپاہیوں کو چور کر دیتے۔ محل واپس آتے دربار کرتے۔ ہر کام کو نہایت غور سے خود دیکھتے۔ انھوں نے انتظام میں ایک نئی روح پھونک دی۔ مسلم ان سے بہت متاثر ہوا۔ انھوں نے مسلم کو اپنا خاص مصلاح کار بنا لیا۔ چند ماہ میں انتظام کا رنگ ہی بدل گیا۔ سب کام ایسا چوکس چلا جیسا اودھ کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ چلا تھا۔

انگریز خائف نظر آئے۔ مسلم کو امید ہوئی کہ ان کی مکاری اب نہ چلے گی۔

مگر ایک دن دسترخوان پر بادشاہ جلوہ افروز ہوئے۔ ماش کی کھچڑی کا بڑا شوق تھا۔ وہ نہایت عمدہ قاب میں سامنے رکھی گئی۔ بادشاہ نے دو ہی نوالے کھائے تھے کہ تڑپ کر اٹھ کھڑے ہوئے "آگ آگ" کہنے لگے۔ طبیب خاص کو فوراً بلایا گیا۔ اس نے نبض دیکھی اور کہا "کشتہ۔ سانپ کا کشتہ کھلا دیا گیا"۔ کھچڑی کو طبیب گھر لے گئے اور مزید تصدیق کی کہ سانپ کا کشتہ ہی اس میں ملایا گیا تھا۔

کس نے ملایا؟ کس نے ملوایا؟ کون دیکھتا؟ بادشاہ کی بیقراری میں سب بھول گئے۔

بادشاہ کو تخت پر لٹا کر برف کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ صرف چہرہ کھلا تھا۔ ٹھنڈائیاں دی گئیں۔ وہ آرام کر گئے۔ جب شام کو بیدار ہوئے تو سوائے عورتوں کے کوئی مرد بھی نہ رہ گیا تھا۔ محل میں جوان اور حسین عورتوں کا مجمع کرا دیا گیا۔ بادشاہ بہت بری طرح اٹھے۔ تھوڑی دیر میں بے حال ہو گئے۔

مسلم نے طبیب سے دریافت کیا کہ یہ کیا ہوا۔ طبیب نے کہا: "کھچڑی میں سانپ کو مار کر چالیس مرغوں کو کھلایا جاتا ہے۔ پھر ہر روز ایک مرغے کو مار کر باقی مرغوں کو اس کا گوشت کھلایا جاتا ہے۔ آخر میں ایک مرغ رہ جاتا ہے۔ اس کی یخنی کھینچ لی جاتی ہے۔ اس سے زیادہ کشتہ ممکن نہیں۔ اسی کو کھچڑی کی دیگ میں ڈال دیا گیا۔ حرکت انگریزی ہے۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ بادشاہ اب سرائے عورتوں میں رہنے کے سوا کسی کام کے نہیں رہ گئے۔ قیامت کی گرمی خون میں آجاتی ہے۔ دس بارہ عورتوں کو ایک دفعہ میں پیاسا کر دینا کوئی بات ہی نہیں ہے۔"

مسلم کو بڑا افسوس ہوا کہ کیسی لاجواب فطرت کو ایک دوا سے بیکار کر دیا گیا۔

اب کیا تھا قیصر باغ میں رنگ رلیاں ہونے لگیں۔ سالی پروین کو خاص محل میں داخل ہو گیا تھا۔ ایک رات بادشاہ محل میں آکر خاص محل کے پاس سو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اکڑ ہتھے سے بے لبس ہو گئے .... جتنی خواصیں تھیں ...... پروین محل سے نکل کر بھاگ آئی اور مسلم سے سارا حال بیان کیا۔

خاص محل نے عاجز آکر بادشاہ کو اپنے یہاں آنے سے منع کر دیا۔ اب یہ کیا تھا۔ رنگ رنگ کی عورت قیصر باغ میں لائی جاتی۔ ہر قسم، ہر رنگ، ہر طبقے کی عورتیں جمع ہو گئیں۔ ہر ایک کو زیور دیا جاتا، محل دیا جاتا اور کوٹھیوں میں حصہ دیا جاتا۔ فوج کی قواعد، دربار بند۔ اہلکار جیسے چاہتے کام کرتے۔ رنڈیوں، سارنگیوں، طبلچیوں کا راج ہو گیا۔

پروین کو خاص محل خود بلاتیں۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر انگریز کے فریب کا رونا روتیں۔

خاص محل کی کوٹھی قیصر باغ کے کونے پر تھی۔ یہاں سے باغ پورا دکھائی دیتا تھا۔ بادشاہ صفید بارہ دری میں رہتا تھا۔ ہر وقت عورتیں ساتھ رہتی تھیں۔ ناچ گانے کی آوازیں فضا میں گونجتی

Scanned with CamScanner

شاہی امام حسین آباد کے امام باڑے میں تو ہر قسم کی رسوم ادا ہی ہوتی تھیں یہاں تک
کہ جلوس کے ساتھ ساتویں تاریخ کو مہندی اور رسوم سے اٹھائی جاتی یعنی میر
کو شہر پر تمام جلوس
کی بارات کی طرح حضرت قاسم کی برات ہوتی۔ نویں کو امام باڑوں پر روشنی کی جاتی اور دسویں
کو شہر بھر جلوس کے ساتھ کربلا میں لا کر دفن کر دی جاتی۔ مگر اسی قسم کے رسوم کی نقل شہر کے
رؤسا کرتے۔ مسلم علی خاں کی عزاداری کو خاص طور پر شہرت ہوئی۔ رانی چھپن صاحب نے اپنی
مجلس بڑی شان سے کیں۔ ان میں حبشنوں کا ماتم خاص چیز ہوتی تھی۔ یہ مجبوریاں مرثیہ پڑھ کر با
صورت نوحہ حلقہ بنا کر گھومتی جاتیں اور جھک جھک کر سینوں پر ہاتھ مارتی جاتیں۔
ان کے ماتم سے عجیب وحشت ناک آواز نکلتی جو ساری مجلس پر ایک خاص قسم کے جوش کا
اثر طاری کر دیتی۔ بیگم صاحبہ خود اپنے قالینوں پر کھڑی ہو کر سینہ کوبی میں اس طرح محو ہو جاتی جیسے
سارے عالم کو بھول گئی ہو۔ ان کی تیلیوں کی کھنک ان کے سینہ پر ہاتھ کی دھمک عجیب دلکش کرشمہ ہو جاتی
آخر خاتمہ پر علی علی کی صدا: الوداع الوداع میں تبدیل ہو جاتی اور ساتھ ہی تاشا باجہ بجایا
جانے لگتا۔

دن میں مردانی مجلس ہوتی جس میں مسلم کے تمام احباب و دوست شریک ہوتے اس
میں زیادہ تر تحت اللفظ مرثیے پڑھے جاتے۔ مسلم کوئی حضرات کے یہاں مجلس میں جاتا تو
اور اس کا سارا دن اسی میں صرف ہو جاتا۔ محرم اور چہلم کے درمیان کچھ روز مخصوص مجالس بھی
بھی ہوتے ان میں شہرۂ آفاق مرثیہ گو میر انیس اور مرزا دبیر تو تصنیف مرثیے پڑھتے جہاں ان
ان دونوں میں سے کوئی پڑھتا وہاں بھیڑ کی انتہا نہ ہوتی۔ مرزا دبیر نہایت سیدھے انسان
تھے اور مجلس کے لئے وعدہ کرنے میں دیر نہ لگاتے۔ مرثیہ بھی جلد کہہ لیتے تھے۔ میر انیس ذرا
الگ آن بان رکھتے تھے کسی کو نظر میں نہ لاتے تھے بمشکل سے وعدہ کرتے اور خاص اہتمام سے
مجلس میں آتے۔ مسلم کے یہاں ایک روز خود آ دبیر پڑھنے آئے منبر پر آ کے کچھ رباعیاں سنائیں
پھر یہ قطعہ پڑھا جو پوری مجلس کو یاد ہو گیا۔

تو بچہ ایک جام پر [illegible] سمجھا تھا
بتائے دیتا ہوں کچھ [illegible] کا پتہ
خورشید [illegible] آسمان شرف میں ہے
بلوا [illegible] خراسان [illegible]
اک [illegible] ہے

پھر مرثیہ شروع کیا جس کا مطلع یہ تھا۔

پیدا شعاع مہر کی مقراض جب ہوئی
اور قطع زلف لیلیِ زہرہ لقب ہوئی

اور ایک نہایت ہی شکوہ ترجیع بند یہ تھی۔

زرہ عقب سے [illegible] آتا تھا آفتاب
دن تھا کہ [illegible] آفتاب

مخصوص لوگ جھوم جھوم گئے۔ عوام پر ایک عجیب عالم طاری ہو گیا الفاظ کا
شکوہ ساری مجلس کو ایک عجیب طلسمات کی دنیا میں لے گیا جہاں بڑی ہی سبک خرام
چلتی ہوئی نظر آئی۔ مرزا صاحب کی شاعری رجب علی بیگ کی نثر اور لکھنؤ کی عام تہذیب
سے نہایت درجہ ہم آہنگ تھی۔ ان پر بلاغت کا خاتمہ سمجھا جاتا تھا اور انھیں خدائے سخن
کہا جاتا تھا۔

میر انیس کچھ کم مقبول تھے مگر فصاحت میں انھیں بھی کامل مانا جاتا تھا ان کے
طرفداروں کا گروہ انھیں بھی خدائے سخن کہتا تھا۔ مسلم کو ان کے گھر پر جانا پڑا۔ میر صاحب کے
ہر ادا میں نفاست تھی تخت پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے گھٹنے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ [illegible]
عالم تھا فکر میں غرق تھے قلم سے مسلم کو اشارہ کیا کہ تخت کے نیچے بیٹھ جائیں۔ [illegible]
لئے مسلم خاموش بیٹھا رہا میر صاحب نے اس کی بڑی حسرت افزائی کی تھی [illegible] بلایا تھا
اور بیٹھنے کے لئے اشارہ بھی کر دیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد میر صاحب نے یہ بند کچھ بلند آواز میں پڑھا۔

یا رب چمن نظم کو گلزار ارم کر
اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر
گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر

Scanned with CamScanner

ہمراز شاعری سے رہا۔ کچھ وقت تک اس نے پروین کے خیال کو دور رکھا۔ مگر پھر فطری محبت نے زور کیا اور وہ غالب کے اشعار پڑھتے وقت پروین کا تصور ضرور باندھ لیتا۔ خاص طور سے یہ غزل پڑھتے وقت اسے پروین بہت یاد آتی۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
ذوقِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کبھی وہ پروین کو یاد کر کے یہ شعر پڑھتا۔

دل سے مٹا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ایک دن وہ غالب کے پاس گیا تو انھوں نے اسے اپنی یہ غزل سنائی۔

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
ایک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے نقاب
ہاں شوق اب اجازتِ تمکین و ہوش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بنغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

تسلیم کو محسوس ہوا کہ اس کہانی کی تمام شاعری کو یہ غزل پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ غالب [illegible] اعلیٰ کمال پر کوئی شاعر کبھی بھی نہ پہنچا تھا۔ یہ غزل اس کے [illegible] سامنے محمود خاں [illegible] کا سامان سامنے آ جاتا تھا۔ [illegible] پورے تجربہ کا حاصل تھی۔ غالب نے اس غزل میں کمال کے ساتھ [illegible] غزل کو پڑھتا اور اس کے ہر ہر لفظ پر سوچتا۔ اس کی رعایات میں [illegible] ہوا نظر آتا تھا۔

غالب کی رائے سے اس نے طالب علمی کے انداز میں [illegible] کو خط لکھا۔ [illegible] نے جواب دیا۔ وہ دلی آ جانے کے لئے تیار ہوا۔ اس نے سب [illegible] اسی وقت خبر آئی کہ میرٹھ میں مسلمان سپاہیوں نے انگریز کا حکم ماننے سے انکار کیا [illegible] بادشاہ [illegible] آ رہے ہیں۔ [illegible] بجائے [illegible] کی طرف چلا اور وہاں سے جا ملا۔

Scanned with CamScanner

"بزدل کیسی کمزور عورتوں اور بچوں کو مارتے ہیں۔" اس نے دل میں کہا۔ جگرا سے فکر دلی پہنچنے کی
تھی پر آشوب حالات میں علاقہ کی طرف جانے سے وہ گھبرائی۔ پھر اس نے سنا کہ جھانسی کی
رانی مردانہ لباس پہن کر خود لڑائی میں نکل آئی ہے اور کچھ وفادار اس کے ساتھ ہیں شہر کے مجبور ہو
پھر وہ ان وفاداروں کے ساتھ چلدی اور جھانسی پہنچی۔

میرٹھ سے دلی تک باغیوں کا راج تھا اور اس کا کام مسلم کے لئے کچھ نہ تھا کہ
جہاں کہیں بھی انگریز ملیں ان کو مار ڈالا جائے۔ لکھنؤ میں بھی بغاوت ہو گئی تھی۔ مسلم لکھنؤ کا
چکر لگا رہا تھا۔ ایک دن لکھنؤ کی سڑک پر باغیوں کا ایک گروہ کچھ انگریزوں کو مار کر آگے
بڑھا۔ مسلم انگریزوں کی لاشوں کے پاس سے گذر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ ایک مسلمان بوڑھا
آدمی ایک نعش پر جھکا ہوا ہے۔ اس آدمی نے سیدھے ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ مسلم پر اس کی
نگاہ پڑی۔

"کون؟ مسلم؟" اس آدمی نے کہا

"ہاں۔ تم کون؟ اچھا سید احمد خاں؟" مسلم نے بہت قریب آکر کہا۔

"یہ انگریز ابھی زندہ ہے۔ آؤ اسے اٹھا کر اس بنگلے میں لے چلیں۔"

"مگر یہ کم بخت انگریز؟"

"اس وقت بحث نہ کرو۔ وقت نہیں ہے۔ میں بعد میں تم کو سمجھاؤں گا
اس وقت جلدی سے لے چلیں۔"

دونوں اس زخمی انگریز کو اٹھا کر بنگلے میں لے گئے۔ بنگلہ بالکل خالی تھا مگر اس میں ہر
طرح کا سامان موجود تھا۔ ایک مسہری پر انگریز کو لٹا کر سید احمد خاں ڈاکٹر کی تلاش میں نکلے۔
مسلم اکیلا بیٹھا سوچتا رہا۔ اس کا جی اس انگریز کو بچانا نہیں چاہتا تھا۔ انگریزوں سے اسے
نفرت تھی کیونکہ انگریز مسلمانوں کے دشمن تھے مگر سید احمد خاں سے اس کی ملاقات لال قلعہ
میں ہو چکی تھی اور ان کو اس نے نہایت ذہین اور مخلص انسان پایا تھا اس لئے وہ ان کی

بات ماننے پر مجبور تھا اور ان کا انتظار کرنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔

اسے خبر مل چکی تھی کہ لکھنؤ میں بادشاہ بیگم نے بھی بغاوت کا اعلان کر دیا تھا
اور مہاراجہ بجے سنگھ سمیت تمام راجاؤں کے ان کے ساتھ تھے۔ اس کو خیال ہوا کہ یہ تینوں ہی
بادشاہ بیگم کے ساتھ ہو گئی۔ جھانسی کی رانی کی بغاوت کی خبر بھی دلی پہنچ چکی تھی۔ وہ سوچنے لگا
کہ یہ تمام کھیل عورتوں ہی کا تھا۔ بہادر شاہ کبھی آگے نہ بڑھتے۔ اگر زینت محل ان کی پشت
پر نہ ہوتیں۔ نانا صاحب کو اکسانے والی بھی ان کی بیوی نواب باندہ کی ماں تھیں۔ انگریزی
حکومت تھی تو کمپنی کی مگر انگریزوں کی سلطنت بھی ایک عورت ہی کے ہاتھ میں تھی جس کا نام
وکٹوریہ تھا۔ کیا عورتوں کی حکومت کا زمانہ آ رہا تھا؟ ....

وہ یوں ہی سوچ رہا تھا کہ سید احمد خاں مع ایک ڈاکٹر کے آ گئے۔ ڈاکٹر نے انگریز
کو دیکھا۔ اس کی مرہم پٹی کی اور اسی بنگلے میں ٹھہر گیا۔ انگریز ہوش میں آیا اور ڈاکٹر سے انگریزی
میں باتیں کرتا رہا۔

سید احمد خاں اور مسلم اب اطمینان سے آ کر برآمدے میں بیٹھے۔ باغیوں کے اس
بنگلے میں آنے کا ڈر بالکل نہ تھا کیونکہ وہ لوگ اس بنگلے کو ختم ہی کر چکے تھے اور اب دوسرے
مقامات پر انگریزوں کو مارنے میں مصروف تھے۔

"بھئی یہ سب تم کیا کر رہے ہو میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"کیوں۔ کیا تم اس غدر کو وقتی ہڑبونگ سے زیادہ کچھ سمجھتے ہو۔"

"انگریز ہار جائیں گے۔"

"اچھا مان لیا پھر کیا ہوگا؟"

"پھر سب پرانی طرح سے رہنے لگیں گے۔"

"ہونہہ۔ یا آپس میں لڑیں گے۔ ہندوستان کس کا ہوگا؟ بہادر شاہ کا یا نانا صاحب
کا؟ اور پھر اودھ کس کی حکومت میں ہوگا؟ جھانسی کدھر جائے گا؟ گوالیار کا تانتیا ٹوپی کس طرف جائے گا؟"

Scanned with CamScanner

"بات تو تم ٹھیک کر رہے ہو۔"

"دیکھو میاں غور کرنے کا مقام ہے۔ میں لال قلعہ کا تابعدار ہوں مگر زینت محل کیا کر سکتی ہیں؟ ہندوستان کی حکومت بہادر شاہ کے بس کی چیز نہیں ہے۔ مرہٹے بھی ختم ہو چکے۔ نانا صاحب اور بہادر شاہ اپنی پنشن کی واپسی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ جھانسی کی رانی اپنے گود لئے ہوئے لڑکے کو راجہ بنانے سے آگے کچھ نہیں چاہتی۔"

"مگر انگریزوں کے ختم ہونے پر یہ لوگ اپنا اپنا مقصد حاصل کر لیں گے اس میں کیا برا ہے۔"

"مگر انگریز جائے گا کیسے؟ پنجاب میں اس کی حکومت مستحکم ہے۔ بمبئی میں وہ تیاری کر رہا ہے۔ ادھر کے اضلاع میں اس کی فوج کی تعداد کم ہو گئی تھی۔ دیسی سپاہیوں نے غلبہ حاصل کر لیا۔ اب سر کولن کیمپل فوج لے کر بمبئی سے چل چکا ہے۔ اس کے پاس بڑی بڑی توپیں ہیں، منظم رسالے ہیں، عقل ہے۔ ان سب کو الگ الگ شکست دے دے گا دیکھنا۔"

"تو یہ غدر کچھ نہیں ہوا۔"

"بالکل کچھ نہیں۔ پرانے زمانے کی موت کا غرغرا ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔ پرانا زمانہ مرنے سے پہلے یوں سانس لے رہا ہے اور کچھ نہیں۔"

"مگر میرا دل انگریزوں کے ساتھ رہنے کو نہیں چاہتا۔"

"ٹھیک ہے مگر اب دل کا نہیں دماغ کا دور شروع ہو رہا ہے۔ تم سوچنا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

اور مسلم سوچتا ہوا بنگلے سے باہر اندھیرے میں آ کر دلی کی طرف چلا گیا۔

کچھ ہی عرصے کے بعد مسلم کو محسوس ہوا کہ ہندوستانی بھانڈوں کے گھوڑے چھوٹ چکے۔ بہادر شاہ بابر کی اولاد تھے یعنی گھوڑا چھوڑنے والے بھانڈ کی طرح گھوڑے کی بو باس ہی رکھتے تھے۔ انگریزی فوج نے بابر کے ذہن کو اپنایا تھا اور اس کو ترقی دی تھی۔ اس کے پاس تنظیم تھی اور بہترین توپیں تھیں۔ اس نے دلی کے کشمیری دروازے پر گولہ باری کی اور اتنی ہی جلدی فتح حاصل

کر لی جتنی جلدی بابر نے پانی پت کے میدان میں فتح حاصل کی تھی۔ بہادر شاہ کے دونوں لڑکوں کو گولی مار دی اور بہادر شاہ خود کو گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ بہادر شاہ رو رو کر غزلیں لکھتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ دلی انگریزوں کے قبضہ میں آ گئی۔ مسلمان بری طرح مارے جانے لگے۔ لال قلعہ لٹ گیا۔ مسلم نے روہیلکھنڈ میں پناہ لی۔

روہیلکھنڈ میں وہ نواب حمید الدین خاں کے یہاں ملازم ہو گیا۔ بعد میں [illegible] کی نقل تھے۔ ہاتھیوں کا بڑا شوق تھا اور ان کے پاس باون ہاتھی تھے۔ انھوں نے انگریزوں کا مقابلہ کیا مگر جلد ہار گئے۔ ان کے ایک عزیز کو انگریزوں نے ملا لیا تھا جنھوں نے انھیں پکڑوا دیا۔ انگریزوں نے انھیں تین دن توپ کے منہ پر باندھا رکھا اور تیسرے روز اڑا دیا۔ ان کے [illegible] خاں کے ساتھ مسلم بھی بھاگا۔ ہندو راجہ کا بھیس بدل کر انھیں پناہ دی۔ مسلم وہاں نہ ٹھہرا اور لکھنؤ کی طرف چلا۔

لکھنؤ میں باغی تعلقداروں کو جمع کر کے واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل کے ہاتھ آ گئے تھے۔ ریذیڈنسی پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزی فوج کے آنے کا انتظار کر رہے تھے...... انگریزی فوج نے عالم باغ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر شہر میں داخل ہو کر کافی دیر لڑائی ہوئی مگر آخر میں انگریز جیتے۔ لکھنؤ میں جگہ جگہ لڑائی ہوئی۔ مسلم چپکے سے محل پر آیا۔ اس پر اس کی خاص دوست رشک منیر کا قبضہ تھا جس نے ایک پہرہ چوکی قائم کر رکھا تھا۔ ایک درجن نہایت حسین لڑکیاں الگ الگ رہتی تھیں اور عیاشوں کی آمد و رفت میں وقت کٹتا تھا۔ رشک منیر نے اسے بتایا "رانی آپ کے حکم کے بموجب دلی روانہ ہو گئی تھیں۔ ان کے ساتھ جو لوگ گئے تھے ان میں کا ایک کانپور سے واپس آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رانی صاحب جھانسی پہنچ گئیں۔" رشک منیر نے جواہرات کا ایک صندوق مسلم کو دیا جو پروین امانت کے طور پر رکھوا گئی تھی۔ رشک منیر نے یہ بھی کہا "آپ کا اپنا محل مبارک ہے، چین سے یہاں رہیے۔" مگر مسلم نے جواب دیا: "میری وجہ سے یہ گھر بھی لوٹ لیا جائے گا۔ میں یہاں نہ رہ سکوں گا۔ تم کو یہ گھر مبارک رہے۔" اور وہ ایک لاٹ جواہرات

...کو روانہ ہو گیا۔
الہ آباد کو انگریزوں نے اپنی فوج کا مرکز بنا رکھا تھا۔ مسلم شہر کے قریب ایک گاؤں
میں ایک چمار کے گھر میں چھپا رہا۔
پروین جھانسی کے قلعہ میں رانی کے ساتھ تھی۔ انگریزی فوج نے اس قلعہ کو گھیر لیا۔
لڑائی جاری رہی۔ آخر کار انگریز قلعہ میں گھس گئے۔ رانی لکشمی بائی اور پروین کچھ سپاہیوں کے ساتھ
گھوڑے پر دروازے سے نکل کر بھاگ گئی اور گوالیار کے سردار تانتیا ٹوپی سے جا ملی۔ نانا صاحب
اور نواب باندہ بھی تانتیا ٹوپی کے ساتھ شامل ہو گئے۔ یہ محاذ بہت زیادہ منظم ثابت ہوا۔
انگریز جنرل سر ہیو روز نے اس کا سخت مقابلہ کیا۔ کئی جگہ معرکے کی لڑائیاں ہوئیں۔
مگر جیت آخر انگریزوں ہی کی رہی۔ لکشمی بائی کے ساتھ پروین بھی لڑتی رہی۔ رانی بہت زیادہ
زخمی ہوئی تو وہ اسے ایک باغ میں لے گئی۔ رانی یہاں پروین کے گھٹنے پر سر رکھے دم توڑ رہی تھی
کہ ہیو روز کی فوج یہاں آ گئی۔ انگریز جنرل ٹھہر گیا۔ رانی مر گئی۔ اس کی فوج نے رانی کو سلامی
دی۔ ہیو روز نے کہا "یہ باغیوں میں سب سے زیادہ بہادر تھی"۔ رانی کی نعش کو جلانے کے بعد
پروین کو بھی قید کر کے الہ آباد پہنچا دیا گیا۔ ہندوستانیوں نے انگریز عورتوں کے ساتھ برا سلوک
کیا تھا مگر انگریزوں نے ہندوستانی عورتوں کو بڑے احترام سے رکھا۔
مسلم کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ پروین انگریزوں کی قید میں ہے مگر وہ اس تک نہیں پہنچ
سکتا تھا۔
کچھ دنوں میں انگریزوں نے نانا صاحب والے محاذ پر بھی کامل فتح حاصل کر لی۔ مسلم
نے اپنے دل میں کہا "یہ گھوڑوں کی نقل ختم۔ عجب حالات کے گھوڑے تھے۔"
لارڈ کیننگ وائسرائے ہند نے الہ آباد میں ملکہ وکٹوریہ کا اعلان سنایا جس میں تمام
باغیوں کو معاف کر دیا گیا تھا۔ اب مسلم کو پوشیدہ رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ پروین کو حاصل
کرنے کے لئے چلا۔ اس نے ہر طرف ملکہ وکٹوریہ کی تعریفیں سنیں۔ تمام لوگ اس ملکہ کے جس کو انھو

ں نے دیکھا بھی نہ تھا اِدھر سے دلدادہ ہو گئے تھے۔
دوڑ دھوپ کے بعد پروین اس کے حوالے کر دی گئی۔
"پروین! یہ سارا کھیل مردوں کا تھا" اس نے پروین سے کہا۔
"ہاں تو کہتے ہو۔"
"مرد بھانڈوں کے گھوڑے دوڑا کر رہ گئے۔"
"مگر عورتیں بیچاری تو کچھ نہ کر سکیں۔ آخر مردوں کے تابع رہیں۔"
"مگر اب تم ہی آگے آتی جاؤ گی۔ تمہارا صندوقچہ میرے پاس ہے۔ تم جو چاہو اس
سے خریدو۔ میں تمہارا دستِ نگر رہوں گا اور کیا کر سکتا ہوں۔"
پروین ایک نئے انداز سے کھل گئی۔ وہ مسلم کے ساتھ روانہ ہوئی تو یہ معلوم ہوتا
تھا کہ وہ رانی تھی اور مسلم اس کا ملازم تھا۔

حصہ پنجم

تم نہیں جانتے

"یُو ڈُو ناٹ انڈر اسٹینڈ"

You do not understand.

Scanned with CamScanner

"صاحب ہمری سمجھ میں کچھو ناہیں آوت۔"

"سید جی سید جی سڑکیں ہیں اور تیری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

"سید جی سید جی ہیں ای واسطے سمجھ میں ناہیں آوت۔ اور سب بنگلے ایک ہی سے۔ آئیں کرن سیدھے۔ کا چکر آنے۔ یہ انگریج کا چکر پھیلائن ہیں۔"

"چکر؟"

"ہاں صاحب بالکل چکر۔ عجیب چکر آئے۔"

"چکر؟" محترمہ نے کہا

"اللہ کا نام لے کر ہم اس سڑک پر چلتے ہیں" کوچوان نے کہا اور چل دیا۔ گاڑی چلتی گئی۔ پھر ایک چوراہے پر رکی۔ پھر اٹکل سے چلی۔ چکر پر چکر کھاتی رہی۔ مسٹر اور مسز جھلا رہے ہیں۔ "تم نہیں سمجھتے"۔ "تم نہیں سمجھتیں" کی پکار رہی...... آخر کو گورنمنٹ ہاؤس پہنچ ہی گئے۔

لفٹنٹ گورنر نے سب سے ہاتھ ملائے۔ نشستیں انتظام کیا۔ چائے کی پارٹی ہونے لگی۔ ایک میز پر مسٹر اسلم بیٹھے تھے۔ ان کے پاس آکر تین اور صاحب بیٹھے۔ ایک بولے "سرسید بڑا کام کر رہے ہیں۔ چندہ خوب جمع کرتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں اپنی ٹوپی بھر کر واپس آتے ہیں۔ کالج بنا ہی لیا۔ آدمی ہو تو ایسا۔"

"کالج!" دوسرے بولے "اکبر نے خوب کہا ہے ؎

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

یوں قتل سے لڑکوں کے وہ بدنام نہ ہوتا

یہ سب انگریز کا کیا دھرا ہے۔ سرسید انگریز کے ایجنٹ ہیں۔"

"میری والدہ" تیسرے نے کہا "کہتی ہیں، یہ اس موئے کو کیا ہوا۔ سید ہو کے عیسائی ہو گیا۔ سید احمد سے سرسید نام کر دیا انگریزوں نے۔"

ایک طرف ایک میز پر چار عورتیں بیٹھی تھیں۔ ان میں محترمہ بھی تھیں۔ ایک ہندو صاحبہ نے کہا "تمہارے سید میاں نے یہ کیا کیا کیا۔ اپنا سب روپیہ علی گڑھ کالج کو دے دیا۔"

"میں منع کرتی رہی مگر وہ ایسے تم نہیں سمجھتیں۔ خیر اب بارسٹری میں انھوں نے بہت کما لیا ہے۔"

"مگر ہوگا یہ کالج جھگڑے کی جڑ۔" تیسری نے کہا "بنارس میں ہندو کالج بھی اس کے مقابلے میں بنے گا۔ کیا ہوگا میں کہتی ہوں۔"

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ عجیب چکر شروع ہوا ہے۔" محترمہ نے کہا

مسلم اب کرسی سے اٹھا۔ کچھ دور پر کئی میزیں ملائے ہوئے سات آٹھ صاحب موجود تھے۔ انھوں نے کہا "آؤ بھائی مسلم ادھر آؤ۔"

وہ ان میں شامل ہو گیا۔

"سرسید تمہاری قوم کی بڑی خدمت کر رہے ہیں" ایک ہندو صاحب نے کہا

"قوم کی" ایک مسلمان بولے "قوم کو خراب کر رہے ہیں۔ کافر کہیں کے۔" اکبر نے خوب کہا ہے ؎

مذہبی درس الف بے ہو علیگڈھ تے ہو

سب مسلمان عیسائی ہو کر رہ جائیں گے۔"

"لکھنؤ میں اودھ پنچ خوب خوب لکھ رہا ہے پیرِ نیچریا۔"

"تم لوگ اپنے دوست کو نہیں پہچانتے۔ وہ اپنی جان دیئے دے رہا ہے اور تم لوگ اسے برا کہہ رہے ہو۔" ہندو نے کہا۔

"مولوی نذیر احمد نے ابن الوقت لکھی ہے خوب۔ ابن الوقت سرسید ہیں۔ اکبر نے کہا۔

ترجمہ کن بجائے خود بوٹ ڈاسن و پتلون

کہ سرسید خبردار وزرا ہ در بیم منزل ہا"

"یہ سب بکا کریں گے مگر سر سید اپنی کئے جائے گا۔ کامیاب ہو کر رہے گا۔" مسلم بولا۔

"ہاں تم تو بالکل انگریز ہو گئے ہو۔ تمہاری بیگم بھی پردہ نہیں کرتیں۔ اکبر نے خوب کہا تمہاری بیگم کو دیکھ کر کہا وہ بھڑ سے بیزار رہے تھے۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

"واہ۔ واہ" کہہ کر سب ہنسے۔ مسلم خاموش رہا۔

"بھائی میری بیوی سے میں نے پردہ توڑنے کو کہا تو بگڑ گئی۔" ایک صاحب جو اب تک خاموش تھے بولے۔

"اکبر نے اس پر بھی کہا ہے۔

پردے کا مخالف جو سنا بول اٹھیں بیگم
اللہ کی مار اس پہ علی گڑھ کے حوالے"

"آپ لوگ کچھ کہیں مجھے تو مسدس حالی نے پھڑکا دیا۔" مسلم بولا

"مسدس واہ کیا شاعری ہے۔

نہ چاقو نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا
صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا

کیا شاعری ہے۔ نیچرل شاعری۔ اماں سیدھی سیدھی نثر کیوں نہ لکھو کیا لغویت ہے۔" ایک کالستھ صاحب لپکتے ہوئے آئے اور بولے "عجیب دور ہے کوئی کچھ سمجھا ہی نہیں ہر ایک دوسرے سے کہتا ہے۔ "یو ڈونٹ انڈر اسٹینڈ" کاش کوئی آدمی ایسا ہو کہ جو کہتا ہم سب سمجھتے ہیں۔ واہ۔"

"سر سید ایک آدمی ہے جو سمجھتا ہے۔" مسلم نے کہا

"بھگوان جانے۔" کالستھ بولے۔

پھر ہنگامہ ہوا۔ لوگ اٹھے۔ لفٹننٹ گورنر سے ہاتھ ملائے اور اپنے گھر جانے لگے۔ مسٹر مسلم اور مسز مسلم بھی اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھے۔ گاڑی چلی۔ اب اس نے زیادہ چکر نہیں کھائے اور بنگلے کو واپس پہنچ گئی۔

کپڑے بدل کر مسلم اپنے آفس کے کمرے میں آیا۔ میز پر تہذیب الاخلاق کا پرچہ رکھا تھا۔ اس نے پڑھا۔ پھر میز کی دراز سے ایک کاپی نکالی اس میں لکھنے لگا: "سر سید بہت بڑا آدمی ہے۔ قوم اسے نہیں سمجھتی نہ سمجھے۔ وہ اپنا کام کر رہا ہے۔ وہ جس کے ساتھ کر رہا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلی لا رہا ہے۔ کیا نثر ایجاد کی ہے۔ اس کے ساتھی حالی نے شاعری کا رنگ بدل دیا...... کوئی کچھ کہے میں اس کو نہ چھوڑوں گا۔ وہی اب قوم کا لیڈر ہے......"

اتنے میں اس کے کچھ موکل آ گئے اور وہ ان کی طرف رجوع ہو گیا۔

رات میں کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آیا۔ اس میں اس نے انگریزی ادب کی بہت سی کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ اس دور کے انگریزی شاعر ٹینی سن، براؤننگ اور آرنلڈ سے اسے خاصی دلچسپی ہو گئی تھی۔ ناول نگاروں میں اسکاٹ اسکا فیورٹ تھا اور اس کی تمام ناولیں اس کے پاس موجود تھیں۔ ڈکنس اور تھیکرے کی بھی چیدہ چیدہ ناولیں اس نے پڑھی تھیں۔ آرنلڈ کے اثر سے اسے ورڈسورتھ سے بھی رغبت ہو گئی تھی۔ مناظر قدرت سے دلچسپی اس کو ہمیشہ تھی مگر ورڈسورتھ کی نظر نے اس میں قدرت سے عجیب قسم کی محبت پیدا کر دی تھی۔ اسے شبنم پر اور سر سبز پر ایک عجیب روشنی دکھائی دیتی تھی۔ ورڈسورتھ کی اپنی بیوی پر نظم اسے زبانی یاد تھی اسے محسوس ہوتا کہ یہ نظم اس کے پروین کے تصور کی ترجمان ہے۔ نظم کا پہلا حصہ اسے اس وقت کی یاد دلاتا جبکہ اس نے پروین کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ اس بیت پر سر دھننے لگتا۔

Scanned with CamScanner

A dancing shape an image gay,
To haunt, to startle and waylay

پروین اس کے پاس آتی۔ اسے نظم کے آخری حصّہ کا خیال آتا۔ وہ اس کے لئے وہی کچھ ہو گئی تھی جو ورڈسورتھ نے اس بیت میں بتایا ہے

A perfect women nobly plann'd
To warn, to comfort, and command.

مگر آرنلڈ کی تنقید کے باوجود انگریزی شاعروں میں اسے سب سے زیادہ مرغوب شیلی تھا۔ شیلی میں اسے عرفی اور غالب کی روح دکھائی دیتی۔ وہی گرمی۔ وہی بے چینی وہی ماورائی تخیل، وہی دل میں گھس جانے والا راگ۔ شیلی کی "اوڈ ٹو دی ویسٹ ونڈ" اُسے کائنات کے اصول کا ایسا عجیب و پر اثر نقشہ معلوم ہوتی۔ جیسا اسے کبھی کہیں نہ دکھائی دیا تھا۔ اسے پوری نظم زمانی یا وقتی تعمیر اور تخریب کا چکر جس الہام کے ساتھ اس نظم کے آسمانی راگ سے ادا ہوتا تھا ویسا اس نے کبھی پہلے نہ دیکھا تھا اور نہ محسوس کیا تھا۔ آرنلڈ نے اسے یونانی ادب کی طرف بھی رجوع کیا تھا اور اس نے یونانی ڈراموں کے ترجمے بھی پڑھے تھے۔ مگر ڈرامہ نگاروں میں شیکسپیئر اس کی جان و روح میں پیوست ہو گیا تھا۔ کوئی دن نہ جاتا کہ وہ شیکسپیئر کے کسی ڈرامے کا کوئی حصّہ نہ پڑھتا۔ انگریزی تہذیب اور انگریزی زبان سے وابستہ ہونے کا وہ سب سے بہتر حاصل یہ سمجھتا تھا کہ اس کو انگریزی ادب سے واقفیت حاصل ہوئی۔

مگر اس موضوع پر جب وہ کسی انگریز سے بات چیت کرتا تو دیکھتا کہ جاہل انگریز اپنے ادب سے ناواقف ہونے پر بھی کہتا "یو ڈونٹ انڈر اسٹینڈ اَوَر لٹریچر" اُسے بڑا غصہ آتا۔

کئی دن وہ انگریزی ادب سے الگ رہتا۔ رومی۔ حافظ۔ عرفی۔ میر۔ غالب وغیرہ کے کلام پڑھتا مگر پھر خیال آتا کہ انگریز یہ نہیں چاہتا کہ ہندوستانی اس کی بہترین چیز کو اپنائے اور اس طرح آزاد ہونے کی سوچنے لگے۔ اس لئے انگریز ہندوستانیوں کو اپنے تمام علوم کو سمجھنے تک کا اہل نہیں بتاتا۔ یہ خیال آتے ہی مسلم اور شدت کے ساتھ انگریزی ادب میں منہمک ہو جاتا۔

ادب کے ساتھ ساتھ اس نے تمام علوم سے بھی پوری واقفیت حاصل کر لی تھی۔ سائنس کے تمام اصول وہ جانتا تھا۔ مل اور ڈارون سے خوب واقف تھا۔ آدم سمتھ کی اقتصادیات اور بنتھام کی سیاسیات میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ ہر علم کی بہترین کتابیں اس کے پاس تھیں اور اس نے انھیں شوق سے پڑھا تھا۔ فرنچ اور جرمن زبانیں بھی سیکھی تھیں اور ان کا ادب بھی پڑھا تھا۔

اسلام کو وہ اب تنقیدی نظر سے دیکھتا تھا۔ نماز روزہ کو فضول سمجھتا تھا۔ پیغمبرِ اسلام پر انگریزوں کے اعتراضات اسے صحیح معلوم ہوتے تھے۔ ہندو مذہب کی کتابوں کے انگریزی ترجمے اسے بہت اچھے لگتے۔ ہندو مذہب اسے نہایت ہی بدرجہ قدرتی معلوم ہوتا۔ پروین اور وہ مہابھارت کے قصے ساتھ پڑھتے۔ ہندو رسوم میں بھی وہ شریک ہونے لگا تھا۔ غرض اس کا ذہن افرنگی اور اس کا ایمان زُناری ہوتا جا رہا تھا۔ پروین اب اُسے قدرت کا ایک اشارہ معلوم ہوتی۔ سنگم کی اور دو آب کی روح نظر آتی۔ اس کے لمبے لمبے بال زرخیزی کا، اس کی بڑی بڑی آنکھیں زندگی کا، اس کا جسم تمام جغرافیائی حالات کا مجسمہ دکھائی دیتا۔ وہ دیوی تھی۔ وہ اس سے محبت ہی نہیں کرتا تھا بلکہ پوجتا بھی تھا۔ وہ عجیب طرح سے اس پر حاوی تھی۔ اس کی زندگی کے ہر کام پر قابو رکھتی تھی۔ وہ اس کے سامنے کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ جو وہ کہتی وہی وہ کرتا۔ اکثر وہ یہ شعر پڑھتا ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

اسے محسوس ہوتا کہ وہ اس عالم میں پہنچ چکا تھا۔

۲

وہ صبح تڑکے اٹھتا۔ اکبر کا یہ شعر اس پر پورا اترتا تھا ؎

کہاں باقی ہے ہم میں وہ اوراد سحر گاہی
وظیفہ کی جگہ پایونیر یا آئی ڈی ٹی ہے

پانیر اخبار جس کو روڈیارڈ کپلنگ ایڈٹ کر رہے تھے۔ اس کے سرہانے رکھا ملتا۔ وہ پڑھنے لگتا۔ یہ اخبار بھی نئے دور کی عجیب چیزوں میں تھا۔ اس سے تمام ملک کے حالات ایک نگاہ میں معلوم ہو جاتے۔ اسے اخبار ایک اسٹیج معلوم ہوتا جس پر دنیا کے حالات کا ڈرامہ نت نئے رنگ میں دکھائی دیتا۔ اس نے اور پروین نے یہ طے کر لیا تھا کہ الہ آباد سے باہر کبھی نہ جائیں گے اور اب نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ ملکہ جو ان دونوں کو بلاتے اور جانا پڑتا مگر دنیا کی سیر کا شوق اب پہلے سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ شوق اخبار سے پورا ہو جاتا۔ اخبار کو اوراد سحر گاہی کی جگہ رکھنے کا نتیجہ یہ بھی ہوا تھا کہ اگر پوری دنیا نہیں تو پوری قوم سے دلچسپی تو کی جگہ آگئی تھی۔ جیسے پہلے زمانے میں اللہ کی طرف رجوع اور اللہ سے محبت سب سے زیادہ اہم چیز تھی ویسے اب قوم کا خیال اور قوم سے محبت ایمان ہو گئی تھی۔ پہلے خود کو خدا میں جذب کر دیتا تھا اب خود قوم میں جذب ہو جاتا تھا۔

قوم جو کچھ کر رہی تھی اس کا کھیل اخبار کے صفحوں پر چلتا پھرتا دکھائی دیتا۔ اسے ایک نئی سوجھی تھی وہ یہ کہ وہ تمام اہم خبروں کی کٹنگ نکال لیتا اور اپنی ڈائری میں چپکاتا جاتا۔ اسے امید تھی کہ اس طرح قومی ڈرامے کا پورا سین اس کے پاس محفوظ ہو جائے گا۔ وہ یہ روز کرتا اور اس کے پاس ڈائریوں کا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ان میں سے اہم ترین صفحوں کو الگ کر لے اور ایک جلد میں بندھوا لے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ پھر اس نے جلد کے کچھ صفحات میں اوپر لال پنسل سے نشان لگا دیے تھے ان میں ہر سال نہیں تو ہر دسویں سال ضرور چند اہم صفحے ضرور شامل ہوتے رہتے۔

اکبر کے زمانے میں اس کے کردار کا رجحان ادب کی طرف تھا۔ مگر وہ خود کبھی ادیب نہ ہو سکا تھا۔ انگریزی ادب سے شوق نے اسے بھی تخلیق کی طرف رجوع کر دیا تھا۔ اس نے ان تمام جمع کی ہوئی کٹنگز کو مربوط کر کے ایک سیریل ڈرامہ سا بنایا تھا جو ایک طرح پر اس کے پورے تجربے کو پیش کرتا تھا۔ اس کو سیریل ڈرامہ کہنا بھی غلط ہے۔ یہ ایک ایسی صنعت تھی جو بالکل نئی تھی حالانکہ اس کو ڈرامہ کہا جا سکتا تھا۔ انگریزی ادب نے ہی اسے لفظ آزادی سکھایا تھا اور اس کی تصنیف کا موضوع آزادی تھا۔

مقام سین۔ گنگا جمنا کا سنگم
شیکسپیر کا ایریل آزادی کا گیت گاتا ہوا آتا ہے۔

Where the bee sucks, there suck I
In a cowlip's bell I lie :
There I couch when owls do cry
On the bat's back I do fly
After summer merrily :
Merrily, merrily, shall I live now
Under the blossom that hangs on the bough.

ملٹن کا لیت گرو گاتا ہے۔

And in thy right hand lead with thee
The Mountain Nymph, sweet Liberty.

(اوکٹیو ہیوم انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھتا ہے)

ہیوم: یہ جماعت ہندوستانیوں میں قومی تصور کی تعمیر کرے گی۔ اس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں گے۔ ہندوستانی ایک نیشن ہیں۔ رفتہ رفتہ قومی ذمہ داری کو سنبھالنے کے قابل ہوں گے اور ان کو ان کے ملک کی حکومت سپرد کر دی جائے گی۔

(ہندوستان کے لوگ ایک بھیڑ کی صورت میں داخل ہو گئے ہیں اور لبیک لبیک کی صدا بلند ہوتی ہے) سر سید آتے ہیں۔

سر سید: ابھی قوم کو سیاسی کاموں کی طرف توجہ نہ دینا چاہیے۔ ابھی تعلیم و تعمیر کی ضرورت ہے۔

(ان کی آواز بھیڑ کی آواز میں گم ہو جاتی ہے۔)

لارڈ کرزن وائسرائے داخل ہوا

کرزن: بنگال کا صوبہ بہت بڑا ہے اس کے دو حصے کر دیے جائیں مغربی بنگال، مشرقی بنگال۔

ہندوستانیوں کی بھیڑ میں سے بنگالیوں نے الگ ہو کر نہیں نہیں، نہیں کا شور مچایا۔

بھنکم چند (چٹرجی): بندے ماترم!

(تمام بنگالیوں نے زور زور سے یہ نعرہ لگایا)

کرزن: صوبۂ شمالی مغربی اور اودھ کا اب نام یونائیٹیڈ پروونسز ہوگا۔ یو۔پی۔ لکھنؤ اس کا دارالسلطنت ہوگا۔

[مسلم:- چودھینا اب ہمارا صوبہ یو پی ہے۔ اُم آ یا رونق۔ اُم چودھین سب یو پی کا ہوئے۔ تم کو یو پی کہا کروں گا۔ یو پا، یو پی۔

یو پا: کیسا اچھا نام ہے، مسٹر یو پی مُسلم۔ آ ہا ہا ہا

مسلم: ہم اور تم مل کر اب اصلاح اور آزادی حاصل کریں گے ہمارا شہر اب پورے ہندوستان کا مرکز ہے۔]

محمد علی، شوکت علی، جناح، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، حسرت موہانی، سر آغا خاں، ابوالکلام آزاد، میاں محمد شفیع داخل ہوئے۔

سب:- ہم کانگریس کی پالیسی پر عمل کریں گے۔

لارڈ منٹو وائسرائے آیا

ہندوستانیوں کے گروہ میں سے مسلمان الگ نظر آئے اور ایک ایڈریس پیش کیا۔ "ہم مسلمان الگ قوم ہیں، ہمیں الگ حقوق دیے جائیں۔"

منٹو:- اس پر غور کیا جائے گا۔ مگر ہندوستان کی سب قومیں ایک رہیں تو اچھا ہے۔

مسلمانوں نے لیگ کے اجلاس کئے۔ ڈھاکہ، کراچی، لاہور، دہلی، الٰہ آباد، لکھنؤ، امرتسر، ناگپور۔

سب لیڈروں نے کہا:- لیگ اور کانگریس کی قوتیں مشترک ہونگی ہندو مسلم اتحاد کی سعی جاری ہوگی۔

تلک، موتی لال نہرو، مہاتما گاندھی، لالہ لاجپت رائے، جوان جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو داخل ہوئے۔

(حسرت موہانی اور تلک نے ہاتھ ملائے۔ مہاتما گاندھی کے محمد علی نے چرن چھوئے۔ جواہر لال محمد علی کے سکریٹری ہوئے۔ لالہ لاجپت رائے کو سب نے گلے لگایا۔)

"ہندو مسلم اتحاد زندہ باد۔ ہندو مسلم ایک ہو۔ ہندو مسلم ایک ہو۔" عوام نے نعرے لگائے۔

Scanned with CamScanner

جناح اور سروجنی نائیڈو میں بڑا ربط نظر آیا۔ سروجنی نے ایک نظم پڑھی۔

شہنشاہ جارج پنجم اور ملکہ میری کی دہلی میں تاجپوشی

رابندرناتھ ٹیگور: جن گن من ادھینائک جیا ہے ..... بھارت بھاگ
ودھاتا۔ "شہنشاہ ہند زندہ باد" عام گروہ نے نعرے لگائے۔

مسلم لیگ کا اجلاس محمد علی جناح کی صدارت میں

جناح: کانگریس اور مسلم لیگ میل جول کے ساتھ ملک کی آزادی اور فلاح
بہبود کے لئے جدوجہد کریں گی۔

جنگ عظیم کے نگاڑے بجنے لگے۔ گروہ میں سے سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں
لوگ فوج میں شامل ہوئے۔

برج نرائن چکبست گاتے ہوئے آئے۔

ہاں دلیران وطن دھاک بٹھا کر آنا — طنطنہ جرمن خود بیں کا مٹا کر آنا
تیری تخت کی بنیاد نہ ہلا کر آنا — ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا

یہ ہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لئے
دھار تلوار کی ہے پار لگانے کے لئے

مولانا محمد علی آگے بڑھے۔

محمد علی۔ جنگ عظیم ختم ہو گئی۔ انگریزوں نے ترکی کے خلاف تشدد کرنا شروع
کیا۔ خلافت کو ختم کر دیا۔ اس کے خلاف قدم اٹھایا جائے ترک موالات کی تحریک
شروع کی جائے۔

گاندھی: ہم ترک موالات ستیہ گرہ سے حکومت کے خلاف پُرامن مقابلہ
اور نافرمانی کریں گے۔

گروہ کی آواز:-

بولی اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دیدو

(چندہ ہونے لگا۔ مسلمان عورتوں نے اپنے زیورات دے دیئے۔
لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے داخل ہوئے۔ حکومت ہند نے رولٹ ایکٹ
پاس کر دیا)

ہندوستانیوں کے گروہ میں شورش بپا ہوئی سرکاری عمارتوں میں آگ لگائی
گئی۔ مارشل لا لگا۔ جنرل ایڈوائر نے جلیانوالہ باغ امرتسر میں قوم پرستوں کے جلسے پر گولی
چلائی۔ چار سو مارے گئے سینکڑوں زخمی ہوئے۔ جلوس اور جلسے پہ پابندی لگا دی گئی۔)

لارڈ ریڈنگ داخل ہوئے

ریڈنگ: ترک موالات کے تمام لیڈروں کو قید کی سزا۔

عوام کی آواز:-

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(گاندھی جی لنگوٹا باندھے ہوئے چرخہ چلاتے ہوئے نظر آئے۔ عوام نے
گاندھی ٹوپی اور کھدر کا کرتا پہن لیا۔)

[مسلم:- بیوپا دیکھو میں یہ کھدر کے تھان لایا ہوں۔
بیوپا:- میں ان کی ساڑیاں بناؤں گی اور تمہارے لئے کرتے اور ٹوپی۔
مسلم: گھر کے پردے اور فرنیچر کے غلاف۔
بیوپا: ہاں ہمارے گھر میں کھدر کے سوا کچھ نہ نظر آئے گا۔]

اقبال گاتے ہوئے آئے:-

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

چکبست :-

اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جس سے ہوتی تھی آب یاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یونان کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

پنڈت مدن موہن مالویہ، پرشوتم داس ٹنڈن داخل ہوئے۔

مالویہ: ہندو ایک الگ قوم ہے۔ بنارس میں ہندو یونیورسٹی بننا چاہئیے"
ٹنڈن: اردو مسلمانوں کی زبان۔ اس کا رسم الخط قرآن کا رسم الخط ہے اور
اس کے الفاظ عربی فارسی ہیں۔ ہماری زبان اردو نہیں ہے ہندی ہے۔

[لوپا: یہ کون بھوت آگئے ہیں۔ یہ سب گڑبڑ کر دیں گے۔
مسلم: یہ لالہ ڈرینڈنگ کے پٹھو ہیں۔ مگر املد کے گرگے ہیں)

آل پارٹیز کانفرنس

تمام لیڈر: حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ ملک کو خود مختاری کا کامل آزادی دی جائے۔
پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی جائے جو رپورٹ پیش کرے۔
[مسلم: یہ نہرو رپورٹ تو ہندو راج چاہتی ہے۔
لوپا: سید حسن کے معاملے سے پنڈت جی خفا ہو گئے۔
مسلم: کچھ نہ، یہ تو چاہتے ہیں کہ مسلمان ہندو راج کے سچے غلام بن جائیں۔

لوپا: یہ تو برا ہوا مگر..........]
(گاندھی جی نمک بنانے جا رہے ہیں..... مسلمان ان کے ساتھ نہیں ہیں)
سائمن کمیشن داخل ہوتا ہے
کنکیوں اور غباروں پر SIMON GO BACK چھپا ہوا اڑاتے گئے
سائمن: سب فرقے الگ الگ رائے اور الگ الگ مطالبے رکھتے ہیں۔ آزادی کے مطالبے کو زیرِ غور رکھا جائے
جناح: ہمیں حکومت برطانیہ کی باتوں میں خلوص و سچائی نظر نہیں آتی۔ اس لئے ہمیں اس پر اعتماد نہیں۔

مسلم لیگ

جناح: میں چاہتا ہوں کہ مسلمان زمانہ کی چالوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک جگہ اکٹھا ہو جائیں سب مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ ایک ایسا قاعدہ ضابطہ بنائیں جسے وہ اپنا سچا نصب العین سمجھیں اور پوری وفاداری کے ساتھ ملک بھر کے مسلمان سچے دل سے اس پر چلیں۔

اقبال:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

[مسلم: لوپا اب سب قصہ ختم ہو گیا۔
لوپا: برا برا ہوا مگر دیکھو۔
مسلم: کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا چکر تھا۔ چکر]

اکبر:-

گاؤ ماتا کا ٹھکانا گاندھی بابا نے کیا   شیخ جی کا اونٹ کس کل بیٹھتا ہے دیکھئے۔

۳

مسلم نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی ادب کی طرف توجہ دی۔ حسرت کی غزلیں اسے بہت اچھی لگیں خاص طور سے یہ غزل:

حسن ہے جس میں تو ہر شے جلوہ گر اس دل میں ہے
جذبۂ صورت پرستی میرے آب و گل میں ہے

محوِ معشوقِ مجازی کیوں نہ ہوں اہلِ نظر
جلوۂ حق آشکارا صورتِ باطل میں ہے

مجھ کو ناصح کیا خبر شورِ جنوں کیا چیز ہے
تیرے سر میں بھی نہیں ہے وہ جو میرے دل میں ہے

لکھنؤ کے شاعروں میں صفی اور عزیز کا بھی کلام اس نے پڑھا۔ مگر یہ بناوٹی معلوم ہوا۔ مگر اقبال ایک نئی اور عظیم چیز تھا۔ حالی کی تحریک کو کمال پہنچاتا تھا۔ اور پھر عرفی سے لے کر تمام شاعروں کا فن بھی اس میں موجود تھا۔ وہ قدرتی شاعر تھا اور جگنو پر اس کی نظم کا یہ شعر ورڈزورتھ سے آگے نکل جاتا تھا۔

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی   نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

اس طرح تارے پر نظم میں بھی قدرت سے گہرا تعلق دکھائی دیتا تھا۔ مگر اقبال قومی شاعر تھا۔

شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

اور تصویرِ درد، شکوہ، جوابِ شکوہ، طلوعِ اسلام، ایک نئی سیاست کا پیغام دیتے تھے۔ اقبال کے کلام کا زور عجیب تھا۔ شکوہ اور جوابِ شکوہ مسلم کو اپنے یاد ہو گئے تھے۔ زیادہ تر وہ یہ بند پڑھا کرتا۔

عہدِ نو برق ہے آتش زن ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے
ملتِ ختمِ رسل شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اسے محسوس ہوتا کہ وہ ہندوستان آنے سے پہلے کے زمانے میں چلا گیا۔ شروع دورِ اسلام کی روح اس میں آ گئی۔ وہ مسلم نہیں تھا۔ اسے مسلم ہونا تھا۔ اقبال نے مسلم بنا دیا تھا اور مسلم سیاست سے کنارہ کش ہونا اس کے لئے مشکل تھا۔

وہ پھر اخبار پڑھنے لگا۔ انگریز نے ہندوستانیوں کو جکڑ دینے کا کام بڑی تنظیم کے ساتھ شروع کر دیا تھا۔ گول میز کانفرنس ہو رہی تھی۔ گول گول سی بات کو گول کر دینے کیلئے یہ کانفرنس بلائی گئی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر عرصے سے بیمار تھے۔ اس میں شریک ہوئے۔ ان کی تقریر کمال کی تھی۔ مسلم اسے بار بار پڑھتا اور اس کی ادبیت پر جھوم جاتا۔ آخر انگریز نے بھی مانا تھا کہ محمد علی کے پاس مکالے کا قلم، برک کی زبان اور نپولین کا دل تھا۔ محمد علی کی تقریر کا یہ حصہ اس نے خاص طور پر نوٹ کر لیا تھا۔

"مجھے اسلام نے پاک صاف زندگی کے طریقے اور رہن سہن کے ایسے سلیقے سکھائے ہیں جن پر چلنا دنیا میں انسان کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا اس کے لئے انسان بننا۔ اسلام ہی انسانیت کا صحیح زندگی کا پورا ضابطہ ہے۔ مذہب اصل میں کسی رسم کا نام نہیں بلکہ وہ انسانی زندگی کی سچائیوں اور گہرائیوں کا ایک مضبوط قانون ہے اور اسلام ہی سب سے بڑے اور سب سے اچھے قانون کا نام ہے۔ اگر آپ مجھے اسلام کے علاوہ دنیا کی کوئی بڑی سلطنت یا کسی ایسی خوشحال قوم میں داخل ہونے کو کہیں جس کا قانون اسلام سے الگ کوئی اور ہو تو میں اسے ہرگز ہرگز منظور نہ کروں گا۔ کیونکہ دنیا کی ہر سلطنت یا قوم کا قانون اور طریقہ اسلام کے بغیر ادھورا ہے۔ اس لئے ہم مسلمان ہند میں اسلامی طریقوں سے الگ کسی قسم کی حکومت گوارا نہیں کریں گے۔"

اسلام کی عظمت کا یہ احساس اسے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ محمد علی اس تقریر کے بعد ہی مر گئے۔ اور انھیں بیت المقدس میں دفن کیا گیا۔ مسلم کے لئے اقبال کے ساتھ ساتھ وہ بھی ایک عظیم ہستی ٹھہرے۔

شوکت علی نے کانفرنس سے واپس آکر عوام کو ابھارنا شروع کیا۔ مگر شوکت علی کچھ نہ تھے محض بھرتی تھے۔ ان پر خلافت کے سلسلے کا چندہ کھا جانے کا بھی الزام لگایا جاتا تھا۔ جناح لندن ہی میں رہ گئے تھے اور وہیں وکالت کرنا چاہتے تھے۔ گول میز کانفرنس کا نتیجہ گول ہی رہا۔

دسمبر ۱۹۳۰ء میں اقبال مسلم لیگ کی صدارت کے لئے الہ آباد آئے۔ ایک کوٹھی میں اجلاس ہوا۔ مسلم اس میں شریک تھا۔ اقبال کی تقریر کا یہ حصہ اس نے نوٹ کر لیا۔

"ہمیں ایسی حکومت چاہئیے جس کی زبان، جس کا رہن سہن اور جس کی

قومیت ایک ہو۔۔۔۔ مسلمانوں کا اپنا رہن سہن اپنی پرانی اسلامی تہذیب کے ساتھ سب سے الگ ہے اور سب سے زیادہ مضبوط ہے۔۔۔۔۔۔۔ ہم نے اپنی حکومت کو اپنے مذہب کی اچھی اور سچی باتوں کو بھلا کر کھویا ہے۔ اب ہم پھر ایسی غلطی نہیں کریں گے۔۔۔۔۔۔ اب تک کے تجربات ہی سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں اپنا ایک الگ علاقہ چاہئیے اور اس میں وہ صوبے ملا کر ہمیں اس کا اختیار دیا جائے جہاں مسلمانوں کی زیادہ آبادی ہے۔۔۔۔۔۔۔"

اجلاس کے بعد وہ اقبال سے ملا۔ اقبال کا لفظ پنجابی تھا۔ اس پر مسلم مسکرایا تو اقبال نے انگریزی میں باتیں کرنا شروع کیں اور انگریزی ہی میں باتیں کرتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد مسلم کو ان کے کلام میں اور بھی دلچسپی ہو گئی۔ بال جبریل کی غزلیں اسے غزل گوئی کے میدان میں اہم ترین اضافہ معلوم ہوئیں۔ اقبال نے اب زیادہ تر فارسی میں کہنا شروع کر دیا تھا۔ مسلم ان کی فارسی کی نظمیں بھی جمع کر لایا اور ان میں کے اشعار پڑھتا رہا۔

اب مسلمان انگریزوں ہی سے نہیں بلکہ ہندوؤں سے بھی برسرپیکار نظر آئے۔ ہندو مسلم فسادات عام چیز ہو گئے۔ مسلمان اپنی تنظیم میں مصروف رہے۔ اب محمد علی جناح سب سے زیادہ نمایاں لیڈر ہو گئے۔ ان کی ذہانت کی تعریف ہندو بھی کرتے۔ وہ مرکزی اسمبلی میں زوردار تقاریر کرتے۔ ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ ہوا۔ اس میں مسلمانوں کے تمام مطالبات مان لئے گئے۔ ہندوؤں نے بڑا شور مچایا۔ قانون ساز اسمبلی میں جناح نے کہا:

"میں سراسر قوم پرست ہوں۔ میں اس اسمبلی کے ممبران سے ایک بار پھر اپیل کرتا ہوں کہ خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو خدا کے واسطے فرقہ وارانہ مسئلوں کو اسمبلی میں زیر بحث نہ لائیں۔"

اس کے بعد کانگریس کے لیڈروں نے خاص طور پر گاندھی جی نے بڑی کوشش

کی کوشش سے سمجھوتہ کریں مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ مسلمان اب دو دھڑوں میں بٹ گئے۔ ایک کانگریس
میں جس کے لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد نظر آئے۔ دوسرے مسلم لیگ میں جس کے لیڈر جناح تھے
ایکٹ کے مطابق صوبوں میں ہندوستانی حکومتیں قائم ہوئیں۔ یو۔ پی میں پنڈت
پنت کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اب مسلمان وزیروں کا سوال ہوا۔ ابوالکلام آزاد نے چودھری خلیق الزماں
سے بات چیت کی۔ دو مسلمان وزیر ہونا ضروری تھے مسلم اس زمانے میں ایک مقدمے کے سلسلہ میں
لکھنؤ آیا ہوا تھا۔ چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کے ساتھ وہ بھی جواہر لال کے ہاں
گیا۔ وہ پیڑ کے نیچے بیٹھا رہا۔ دونوں صاحبان بات چیت کیلئے اندر گئے۔ چودھری صاحب نے
باہر آکر مسلم سے کہا: "دیکھا جواہر لال کہتے ہیں کہ تم دونوں میں سے ایک کو وزیر بنائیں گے
اور ایک وزیر کانگریس کا مسلمان ہوگا۔"

"اور ابوالکلام آزاد نے کیا کہا؟" مسلم نے پوچھا۔

"انھوں نے کہا دونوں کو لو۔ اس میں کانگریس کا فائدہ ہے مسلم لیگ ختم ہو جائے
گی مگر جواہر لال نہ مانے۔ پرشوتم داس ٹنڈن نے انھیں بہکا دیا۔"

"تو پھر اب؟"

"ابوالکلام آزاد کہتے ہیں کہ گاندھی جی سے کہیں گے۔ میں تو کہہ آیا کہ میں جاتا ہوں
امین آباد میں اللہ اکبر کا نعرہ لگاتا ہوں۔"

چنانچہ چودھری صاحب نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ راجہ امیر احمد خاں محمود آباد
لاکھوں روپیوں کی تھیلیاں لے کر ان کے ساتھ ہوئے مسلم لیگ کا ایک اجلاس لکھنؤ میں
ہونا طے پایا جس کی ریسپشن کمیٹی کے صدر صاحبزادے راجہ محمود آباد ہوئے۔

اس اجلاس میں شریک ہونے کے لئے مسلم لکھنؤ آنے لگا۔ اماں نے مخالفت کی
دونوں میں بحث ہوئی۔ اس نے کہا "تم نہیں سمجھتے" اس نے کہا "تم نہیں سمجھتیں" اب
زندگی میں پہلی دفعہ وہ اس کی مرضی کے خلاف چلا۔ لکھنؤ پہنچ کر محمود آباد ہاؤس قیصر باغ میں

مقیم ہوا۔ شام کی گاڑی سے جناح صاحب آرہے تھے۔ اسٹیشن پر تمام مسلمانان لکھنؤ کا مجمع
تھا۔ جناح صاحب کی وجہ سے نہیں بلکہ راجہ صاحب کے اثر کی بنا پر جناح صاحب کو ایک
کھلی موٹر میں بٹھایا گیا۔ راجہ صاحب موٹر کے آگے پیدل روانہ ہوئے سارا مجمع پیدل چلا۔
ہمارا جناح زندہ باد: محمد علی جناح زندہ باد کے نعرے لگتے رہے۔ جب جناح صاحب
کی گاڑی سری رام روڈ سے نکل کر امین آباد میں پہنچی تو مجمع پر خاکساروں نے حملہ کر دیا۔ مسلم نے
دیکھا کہ جناح صاحب اپنی سیٹ پر اچھل پڑے۔ مجمع بھاگنے لگا۔ راجہ صاحب کو والنٹیروں
نے گھیر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خاکساروں کو مار بھگا دیا گیا۔ پھر سارا مجمع قیصر باغ روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن لال باغ میں اجلاس ہوا۔ تقاریر ہوتی رہیں۔ مولانا شوکت علی نے
اپنے انداز میں اشارے کئے۔ راجہ صاحب تقریر میں اشکبار ہوئے۔ جناح صاحب نے
تقریر شروع کی تو مجمع نے کہا "اردو میں" "اردو میں"۔ راجہ صاحب نے کہا۔ صدر محترم
اردو نہیں جانتے" جناح صاحب انگریزی ہی میں تقریر کرتے رہے۔ جو خاص بات انھوں
نے کہی وہ یہ تھی کہ

The Congress wants that the Hindus should dominate the Muslims. The Muslim League will see to it that they cannot do so.

"کانگریس چاہتی ہے کہ ہندو مسلمانوں پر حاوی ہو جائیں۔ مسلم لیگ ایسا
نہ ہونے دے گی۔"

آخری اجلاس میں بجنور کے الکشن کے لئے چندہ جمع کیا گیا۔ جناح صاحب خود
بجنور گئے۔ مگر وہاں ان کا نمائندہ ہار گیا اور کانگریس کے حافظ ابراہیم کی پھر جیت رہی۔
چودھری خلیق الزماں مسلم لیگ کے کام میں منہمک ہو گئے۔ راجہ صاحب روپیہ لٹاتے
رہے۔ مسلم الہ آباد واپس آیا۔

رہا کچھ دنوں تنی رہی۔ کانگریس حکومت کو بڑی مشکل پیش آئی کہ صوبہ
کی اس نے سنیوں کو اجازت دے دی تو شیعوں نے تبرا ایجی ٹیشن شروع کیا۔ اس کے
زور کا حال ستم سنتا رہا۔ پھر دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ کانگریس کی حکومت
ختم ہو گئی۔

۴

"کل میں دنیا کا سب سے بڑا جنرل ہوں گا کیونکہ میں پولینڈ پر اتنی بڑی فوج کے
ساتھ چڑھائی کرکے ہوا دکھائی دوں گا جتنی بڑی فوج کی سرداری کبھی کسی نے نہیں کی" ہٹلر
نے کہا تھا۔ ستم نے سوچا۔ "بڑی فوج ہی سے بڑائی ہوتی ہے۔ اکبر نے تن تنہا گجرات فتح کیا
تھا۔ گجرات پولینڈ سے کسی طرح چھوٹا نہیں ہے۔ اور تیزی۔ دیکھنا ہے کہ ہٹلر کے ٹینک
اکبر کے گھوڑے سے زیادہ تیز ہیں۔ اکبر کی گجرات پر چڑھائی اب تک تاریخ کی سب سے
زیادہ تیز کارگزاری ہے۔ گیارہ دن میں سب کچھ ہو گیا تھا۔ کیا ہٹلر اس سے جلدی پولینڈ
فتح کرے گا۔ دیکھنا ہے۔" ہٹلر کی فوج بڑھتی رہی مگر پولینڈ ایک مہینہ میں فتح ہوا۔ تیزی میں
اکبر ہی آگے رہا۔ ٹینک آ گئے۔

جنگ کے حالات میں ہٹلر کا پورے یورپ پر قبضہ بڑا ہی سنسنی خیز رہا۔ ادھر
جاپان کا انگریزی جہازوں کو جنگ چھڑنے سے پہلے ہی برباد کر دینا۔ ستم کو بڑی بداخلاقی معلوم
ہوئی۔ "دیکھیں اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔" اس نے دل میں کہا۔ جاپان سنگاپور تک آ گیا۔ اب
ہندوستان آ جائے گا۔ ہوائی حملوں سے بچت کے لئے الہ آباد میں بڑے خاص سامان
ہوتے رہے۔

Scanned with CamScanner

مسٹر چرچل کی تقریریں بڑے کمال کی چیزیں ہوتی تھیں۔ کیا عزم تھا۔ کیا زبان۔ سادہ انگریزی مقرری کا کمال دکھا رہی تھی چرچل۔ برکت سے آگے نکل گیا تھا۔

روس اور جرمنی لڑنے لگے۔ مارشل ٹموشنکو کی فوجیں مقابلہ کرتی رہیں۔ ماسکو تک ہٹلر پہنچا مگر ماسکو نہ لے سکا۔ لینن گراڈ تک پہنچا مگر اسے بھی نہ لے سکا۔ اسٹیلن گراڈ میں جنگ کی خبریں آتی رہیں۔ ہٹلر کے ٹینکوں کا پٹرول جم گیا۔

"مجھے دس دن اچھے موسم کے مل جائیں تو یورپ کو نازیوں سے صاف کر دوں"

چرچل نے کہا۔

فیلڈ مارشل مانٹ گومری اس دور کا سب سے بڑا سپاہی تھا ایک نیکر اور بنیان پہنے ہوئے تھا اور نارمنڈی میں فوج اتار لی۔ انگریز فوج بڑھتی گئی ہٹلر غائب ہو گیا۔

ادھر گاندھی جی Quit india پوری قوم انگریز کو نکالنے کے لئے تیار ہو گئی آزادی کی لہر قیامت کے ساتھ دوڑ گئی۔ گاندھی جی بھی کس کمال کے آدمی تھے۔ اف، اتنا سارا ملک میں ہڑتالیں اور تیر گرم ہونے لگی۔ کانگریس کے بڑے لیڈر قید کر لئے گئے۔ محمد علی جناح اور لیاقت علی خاں اصلاحی اور تعمیری کام میں لگے رہے۔

بھولا بھائی ڈیسائی اور راج گوپال اچاریہ نے مسلم لیگ کے لیڈروں سے مشورے کئے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کو مل جل کر کام کرنا چاہتے تھے۔

"میں تو ناامید ہو گئی تھی۔" یوپا نے مسلم سے کہا۔

"مگر اب پھر امید بندھتی ہے کہ اتحاد قائم ہو جائے گا اور ملک کی تقسیم نہ ہو گی۔"

"تقسیم کیسے ممکن ہے۔"

"ناممکن ہی نہیں بے معنی بھی ہے۔"

سر اسٹیفورڈ کرپس کے ماتحت ایک مشن انگلستان سے آیا۔ تمام لیڈر اس سے ملتے رہے۔ بات چیت کی رپورٹیں اخباروں میں آتی رہیں۔

محمد علی جناح نے زبردست تقریر کی جس میں انھوں نے کہا۔

"مسلمانوں کا کوئی دوست نہیں ہے۔ نہ انگریز نہ ہندو۔ اب ہمیں انگریز اور ہندو کی متحدہ طاقت سے لڑنا ہو گا۔ یہ بھی بنیئے ہے اور وہ بھی بنیا۔ اسلام ہمیں غیر اللہ سے ڈرنا نہیں سکھاتا۔ ہم ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔"

"بنیا؟" مسلم نے کہا۔

"اور جناح بھی تو بنیا ہے۔ اس کا دادا بھی بنیا تھا۔ جینا سے جناح ہو گیا اور یہ مسلمان کدھر سے ہے۔" یوپا بولی۔

"اب بنیئے ہی کی لڑائی ہے یوپا یہ ہندوستان عجیب ملک ہے۔ یہاں چار قومیں آباد ہیں۔ برہمن۔ چھتری۔ ویش۔ شودر۔ صوفی آئے وہ برہمنوں کی طرح کے تھے ان کا مقابلہ برہمنوں نے کیا۔ شنکر نے توحید کو ویدوں میں دیکھا۔ رام رحمن ایک ہیں کی صدا بلند ہوئی۔ مسلمان سپاہی آیا۔ راجپوتوں کی طرح کا تھا۔ راجپوتوں نے اس کا مقابلہ کیا۔ راجپوتوں سے اس نے میل کیا۔ دونوں ختم ہو گئے۔ انگریز بنیا آیا۔ تجارت کرنے۔ بنگال کے بنیئے نے اس سے میل کیا۔ گاندھی بنیا اسے نکالنے پر کھڑا ہوا۔ جناح بنیا بھی ساتھ ہوا۔ یہ بنیئے ہی اس بنیئے کو نکالیں گے۔"

"اور دونوں بنیئے آپس میں بھی لڑ رہے ہیں۔"

"یہ بھی ضروری ہے۔ انگریز کے جانے سے پہلے حصہ بٹا لینا ضروری ہے اپنی اپنی دکان الگ لگ جائے۔"

"تو ہم اور تم کہاں جائیں گے۔"

"کیوں؟ ہم تم یہیں رہیں گے۔"

"کیسے؟"

کچھ سوچ کر مسلم بولا: "ہمیں مسلمان بنیا بھی مارے گا اور ہندو بنیا بھی۔"

"میں دیکھتی ہوں کہ میری واپسی کے دن قریب آرہے ہیں۔"

"واپسی؟"

"خیر جانے دو اچھا ہے جو یہ انگریز نہ جائے۔"

مسلم جناح صاحب سے ملنے بمبئی پہنچا۔ بار بار سکریٹری سے ملنے کے بعد آخر دس منٹ کی ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ مقررہ وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے وہ مالابار ہل پہنچ گیا۔ سمندر کے سماں اور کوٹھی کی نشست نے اسے عجیب کیفیت میں ڈال دیا: کیا ایسے عیش سے رہنے والا آدمی ایک قوم کو بچا سکتا ہے؟ اس کے دل نے سوال کیا۔ وہ کوٹھی کے دروازے پر تھا کہ ایک کار آکر رکی اور اس میں سے گاندھی جی اترے۔ ان کے ساتھ کئی آدمی اور تھے مسلم بھی ان کے پیچھے پیچھے جناح صاحب کی کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ گاندھی جی کا کوئی نمائندہ نہ تھا۔

اندر اطلاع کرائی گئی سکریٹری نے آکر کہا: "صاحب کہتے ہیں آپ پندرہ منٹ پیشتر آگئے۔ آپ باغ میں انتظار کیجیے۔"

گاندھی جی کے ساتھی متعجب ہوئے۔ گاندھی جی نے کہا: "اچھا میں انتظار کروں گا۔" باغ میں کرسیوں پر سب بیٹھ گئے۔ گاندھی جی نے مسلم کو دیکھ کر نہایت محبت کے لہجے میں کہا۔ "آپ میاں کون ہیں۔"

"میں مسلم ہوں الہ آبادی۔"

"اشا۔ اشا۔ میں نے تمھاری بابت سنا ہے۔ تم مسلمان تہذیب کے بڑے وہ ہو۔ ہاں کہو یہاں کیوں آئے۔"

"میں جناح صاحب سے کہنے آیا ہوں کہ تقسیم سے ہماری تہذیب ختم ہو جائے گی۔"

"ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ اشرباد۔ اشرباد۔" کہکر گاندھی جی نے اسے گلے سے لگا لیا۔

ہم تم آپس میں۔ یہ گوشت ٹکڑے ہیں جو شور مچاتے ہیں۔"

اب جناح صاحب کا سکریٹری آیا اور گاندھی جی اس کے ساتھ چلے گئے۔ مسلم انتظار کرتا رہا۔

کافی دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ جناح اور گاندھی زینے سے اترتے ہوئے آرہے ہیں۔ وہ کھڑا ہو گیا اور میکانیکی طور پر برآمدے کے پاس آگیا۔ گاندھی جی زینے سے نیچے اتر آئے تھے۔ جناح صاحب دو زینے اوپر کھڑے تھے۔ دونوں نے ہاتھ ملائے۔ گاندھی جی نے کہا،

"یو ول ہیو ٹو کٹ می انٹو ٹو بیفور یو کٹ انڈیا انٹو ٹو۔"

You will have to cut me into two, before you cut India into two.

جناح صاحب مسکرائے گردن اونچی کی اور واپس ہوئے۔ وہ نہایت عمدہ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ سگار منہ سے لگا ہوا تھا۔ انگریز بالکل انگریز جنٹلمین معلوم ہو رہے تھے۔ انھوں نے زینہ چڑھتے ہوئے جیب سے گھڑی نکالی، سکریٹری ان کے پاس آگیا۔ پھر ان سے الگ ہو کر زینے اترنے لگا۔ اس کی نگاہ مسلم پر پڑی۔ وہ بولا

"آئیے جلدی صاحب کپڑے بدلنے جارہے ہیں۔"

مسلم لپکتا ہوا زینہ چڑھ گیا جناح صاحب صوفے پر بیٹھے ہوئے سگار میں محو تھے۔ اس نے "سلام علیکم" کہا

"اوعلیکم سالم" جناح صاحب بولے

"میں محمود غزنوی سے لے کر اب تک مسلمانوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ رہا ہوں۔ ہماری روایات اور ارتقا اس تقسیم کو غلط بتاتی ہیں۔"

You do not understan جناح صاحب نے کہا اور اپنا منہ اونچا کر لیا۔

"جی میں بہت کچھ سمجھتا ہوں اور آپ کو سمجھانے کے لئے الہ آباد سے آیا ہوں۔ گنگا جمنا کا سنگم ...."

I have no time. I say, you do not understand

مسلم شپٹا کر خاموش رہا۔ اس نے جناح کی ناک کو غور سے دیکھا۔ منھ سے سگار کا دھواں نکلتے دیکھا۔ ایک آنکھ پر لگے ہوئے شیشے کو دیکھا۔ جناح نے آنکھ پر سے شیشہ اتار کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا "آئی اگین سے مسٹر مسلم یو ڈو ناٹ انڈر اسٹینڈ"

I again say, Mr Muslim, you do not understand.

مسلم چلا آیا۔ راستے بھر وہ سوچتا رہا کہ اس کے یہاں آنے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ جناح نہایت خشک بالکل مکانیکی انسان تھے مگر وہ عجیب یقین، خود اعتمادی اور اطمینان کا ملک تھے۔ یہ آدمی اپنی سی ضرور کر کے رہے گا۔" الٰہ آباد کے اسٹیشن پر اترتے وقت اسے خیال آیا۔

اب سے مسلم کے لئے محمد علی جناح بھی ایک اہم ہستی ہو گئے۔ اسٹف، بیک، سگار، قدرت اپنے کرشمے یوں بھی دکھاتی ہے۔ آرام طلب۔ رنگیلی۔ بانتہذیب خوابوں میں ... قوم کو اس وقت ایسے ہی لیڈر کی ضرورت تھی۔ مسلم کو ماننا پڑا۔

کیبنٹ مشن آیا۔ جناح نے اس سے منوا لیا "پاکستان ضروری ہے۔"

سکھوں اور ہندو مہاسبھا نے آواز بلند کی "ہم پاکستان نہیں بننے دیں گے۔ اگر یہ تجویز پاس کی گئی تو ملک میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا دیں گے۔"

اور ملک میں ہر جگہ ہندو مسلم فساد ہونے لگے۔ الٰہ آباد اور کانپور میں بڑے بڑے فساد ہوئے۔ ہندو کہتے تھے ہم جیتے، مسلمان کہتے تھے ہم جیتے مگر نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔

"اب کیا ہوگا ڈیڈی؟"

"اب میری واپسی قریب آ رہی ہے مسلم۔ میرا دور ختم ہو رہا ہے۔"

لیلا بھی انگریزی ادب میں گہری دلچسپی لینے لگی تھی۔ رابرٹ براوننگ کی نظم "لاسٹ رائڈ ٹوگیدر" اسے بہت پسند تھی اور زبانی یاد ہو گئی تھی۔ وہ اور مسلم دونوں اس نظم

کو ساتھ پڑھتے اور عجیب عالم میں کھو جاتے۔ یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے وہ سونے کے کمرے میں آتے۔

Who knows the world may end tonight

اور ایک ہی بستر پر لیٹ جاتے۔

جناح صاحب کو اب قائد اعظم کہا جانے لگا تھا۔ انھوں نے اردو کا منشی بھی نہ ... امن و آشتی اور صلح کا پیغام ... اس مقام پر پہنچایا جہاں فسادات ہوئے تھے۔

آخر میں ایک گول میز کانفرنس لندن میں ہوئی۔ قائد اعظم، لیاقت علی خاں مسلم لیگ کی طرف سے۔ گاندھی جی، جواہر لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل کانگریس کی طرف سے، بلدیو سنگھ سکھوں کی طرف سے اس میں شریک ہوئے۔ قرار پایا کہ "متحدہ ہندوستان کو آزاد کر کے امن و صلح قائم رکھنا دشوار ہے" اور "ایک عارضی ہندوستانی حکومت کی تشکیل کی جائے۔"

لارڈ ویول صدر حکومت ہوئے۔ جواہر لال نہرو نائب صدر۔ لیاقت علی خاں وزیر خزانہ ہوئے۔ تین اور لیگی ممبر اور باقی کانگریسی ممبر ہوئے اور ۱۶؍ جنوری ۱۹۴۷ء کو یہ حکومت برسر اقتدار آ گئی۔

مگر یہ حکومت چل نہ سکی۔ پٹیل نے مسلمانوں کے ساتھ زیادتیاں کیں۔ لیاقت علی خاں کا بجٹ ہندوؤں سے نہ نگلا گیا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی حکومت نہ بن سکی۔ کچھ ہی عرصہ میں قائد اعظم نے کہا "اب برصغیر میں دو ملکوں کے قیام کی ضرورت مسلم ہے۔"

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم برطانیہ مسٹر اٹیلی نے پارلیمنٹ میں ملک کی تقسیم، آزادی اور قیام پاکستان کا اعلان کر دیا۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہند نے تمام جماعتوں کے اعلیٰ نمائندوں کو شملہ میں بلایا۔ اس رات آٹھ بجے مسلم اور لیلا اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ریڈیو سن رہے تھے۔

پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر آئی۔ انھوں نے کہا "میں ایک ہندوستان کا حامی

ہند۔ میں کیا کروں کہ لیڈر میری بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔"

پھر جواہر لال نہرو کی تقریر آئی "آزادی کا مژدہ سناتے ہوئے مجھے بہت رنج ہے کانگریس نے پوری کوشش کی کہ پاکستان نہ بن سکے مگر مسلمان نہ مانے۔"

بلدیو سنگھ نے جواہر لال کی باتوں کو دوہرایا۔

قائد اعظم کی تقریر سب سے زیادہ زوردار تھی اور وہ "پاکستان زندہ باد" پر ختم ہوئی تھی۔

یوپا اٹھ کھڑی ہوئی اس کے شگفتہ چہرہ پر غم چھا گیا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ مسلم عجیب عالم میں آکر اس کو دیکھنے لگا۔

ریڈ کلف کمیشن نے دونوں ملکوں کے حدود مقرر کئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کا دن آیا۔ مسلم تڑکے اٹھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اس کے منہ سے یہ نکلا

آزادی کا سورج نکلا۔

بادل میں چھپا دھندلا دھندلا۔

پنجاب میں فسادات کی خبریں آئیں۔ لاہور سے ہندو بھاگے۔ امرتسر میں ایک ایک مسلمان کاٹ دیا گیا۔ دہلی میں آگ لگ گئی۔ حکومت کا قابو بالکل جاتا رہا۔ پورے ہندوستان میں ایک عجیب سنسنی دوڑ گئی۔ مسلم پر ایک عجیب خوف ایک عجیب ہراس کا عالم طاری ہوا ایسا اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ پاکستان میں قائد اعظم گورنر جنرل بن چکے تھے۔ کیوں؟ وہ گاندھی جی کی طرح حکومت بنانے والے تھے پھر بھی حکومت سے الگ کیوں نہ رہے؟ مسلم کو نادر شاہ کا جملہ یاد آیا "من آں مرکب را سوار نمی شوم کہ تاش اندیشہ دلم راست"۔ جناح کانسٹیٹیوشنل آدمی۔ کانسٹیٹیوشنل ہیڈ ہی بن کر رہ سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ مسلم لیگ رہا۔ گاندھی جی کانگریس کے چار آنے کے ممبر بھی نہ رہے۔ یہ ان دونوں آدمیوں کی مختلف انفرادیت تھی۔

گاندھی جی نے فسادات کو روک لئے لیکن ایک نئی سوچ: پر اٹھنا سیکھا۔ مگر سب فضول۔ یوپا نے کہا۔

اور ایک صبح کو وہ اٹھی۔ مسلم ابھی سو رہا تھا۔ اس نے اپنے لمبے لمبے بالوں میں کنگھی کی۔ بال کھلے رہنے دیئے۔ وہ کالے کالے بال کمر کے نیچے تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے چہرہ پر آج وہی نور آگیا تھا جو مسلم نے طلوع و غروب کے وقت دیکھا تھا۔ اس نے ہاتھ پر مہندی لگائی۔ اس کے ہمیں سرخ ہونٹ بڑے لطیف انداز پر کھل گئے۔ اس نے آنکھوں میں کاجل لگایا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جادو بھر گیا۔ اس نے سفید ساڑی کو جسم پر بھی کچھ لپیٹا۔ وہ نزاکت اور نفاست کا عجیب کرشمہ نظر آئی۔

مسلم سو کر اٹھا۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہنے اور اس کے سنگھار کے کمرے میں آیا۔

"یوپا۔ آج کیا ہے۔"

"کیوں۔ میں کیسی معلوم ہو رہی ہوں۔"

"تم ویسی ہی لگ رہی ہو جیسی میں نے تمہیں ۱۹۴۲ء میں دیکھا تھا۔ گنگا کے کنارے مندر کے پاس۔"

"اچھا تو ٹھیک ہے...... آؤ چلیں۔"

"کہاں؟"

"وہیں سنگم پر۔"

مسلم اس کے حسن میں محو تھا۔ وہ کمرے سے باہر آئی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ پورٹیکو میں جیپ کھڑی تھی یوپا اسٹیرنگ پر بیٹھ گئی۔ مسلم اس کے پاس بیٹھ گیا۔ یوپا نے جیپ چلا دی۔ سول لائنز کی سڑکوں پر ہوتی ہوئی جیپ شہر کے باہر آگئی۔ یوپا لاسٹ رائڈ ٹوگیدر کی یہ سطور گانے لگی۔

And yet—she has not spoke so long
What heaven be that, fair and strong
At Life's best with our eyes upturned
We, fixed so, ever should so abide?
What if we still ride on, we two
With Life for ever old yet new,
Changed not in kind but in degree
The instant made eternity—
The instant just prove that I and She
And Heaven just prove that I and She
Ride, ride together, for ever ride.

مسلم اس کے چہرہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ عجیب محویت کا عالم اس پر طاری تھا۔

جیپ اس مقام پر پہنچی جہاں ۱۰۲۰ء میں ایک مندر تھا جس میں سے اُما پاروتی نکلی تھی۔ پھر یہ مسجد میں تبدیل ہو گیا تھا۔ مگر اب مسجد توڑ کر پھر مندر بنا لیا گیا تھا۔ نیا مندر جدید طرز کا مندر تھا۔ پاروتی نے یہاں جیپ روک لی اور اتر پڑی۔ مسلم بھی اترا۔ وہ مندر کی طرف چلی۔ مسلم بھی پیچھے پیچھے چلا۔ وہ مندر میں داخل ہو گئی۔ مسلم دروازے پر ہی تھا کہ اس نے دیکھا کہ طاق پر وہ پھر اُما پاروتی کی مورتی بن کر کھڑی ہو گئی۔

"اما۔ پیاری اما۔ پیاری پاروتی۔ تم مجھے چھوڑ گئیں۔ اب میں کیا کروں، کہاں جاؤں"

مورتی سے کوئی آواز نہ آئی۔

"آہ اما میری زندگی ختم کر گئیں۔"

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

مورتی کی دائمی مسکراہٹ قائم رہی۔

"آہ یہ تم نے کیا کیا۔ میں اب بیکار ہو گیا۔ میں تمہارے چرنوں پر دم دے دوں گا۔ تمہارا پجاری بن کر مر جاؤں گا۔"

وہ مندر میں داخل ہو رہا تھا کہ ہندوؤں کا ایک گروہ دروازے پر آ گیا۔

"ارے یہ تو مسلم ہے۔" گروہ میں سے ایک آدمی نے کہا۔

"یہ ہمارے مندر میں گھس رہا ہے۔" کسی نے کہا۔

"میری اُما پاروتی یہاں ہے۔ میں اسے پوجوں گا۔"

"ہٹ ملیچھ ہمارے مندر میں گھستا ہے۔ جوتا کہیں کا۔" اور کسی نے گھسیٹ کر اُسے باہر کر دیا۔

"مار ڈالو اس مسلنٹے کو" کسی نے کہا۔

"ہاں مجھے مار ڈالو۔ مجھے اب جی کر کیا کرنا ہے۔" مسلم بولا

"نہیں مارتے مارتے ہم تھک گئے۔ یہ سالے ختم ہونے ہی کو نہیں آتے۔ پاکستان بنایا ہے۔ ہم یہاں ان کا قبرستان بنائیں گے۔" ایک نے کہا

"اس کے ہاتھ پیر باندھ کر گنگا جی میں پھینک دو۔ آپ ڈوب جائے گا" ایک اور ہندو نے کہا۔

کئی آدمیوں نے اُسے پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط رسی سے باندھ دیے اور اسے گنگا میں پھینک دیا۔ وہ کئی دفعہ تہہ میں پہنچا پھر اُبھرا۔ پھر دھارے کے ساتھ بہنے لگا۔ وہ بہت تیر رہا تھا۔ اس کا جسم سنگم کی لکیر پر پہنچا۔ اس لکیر پر تیرتا رہا۔ لکیر ختم ہو گئی۔ وہ تیرتا گیا تیرتا ہی گیا ..... تیرتا ہی چلا گیا ......

اس کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے۔ اس کا جسم حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اس کا دل چل رہا تھا اور اس کا دماغ سوچ رہا تھا۔

جب تک وہ سنگم کی لکیر پر تیرتا رہا مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ اس کی آنکھوں کے

سامنے پھرتا رہا۔ یہ فسانہ بڑا دلکش خواب تھا۔ قدرت کی ہر خوبصورتی اس کے چاروں طرف تھی اور آما پاروتی اس کے آغوش میں تھی۔ لڑائیاں حکومت۔ مذہب سب ہی کچھ پیارا تھا مگر زندگی لطیف تر ہوتی جارہی تھی۔ کپڑے۔ کھانے۔ سجاوٹ۔ موسیقی۔ عمارت۔ شاعری۔ ہر معاملے میں قدرت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ فنکاری شامل ہوتی جارہی تھی۔ آما اس سب کا اشارہ تھی۔ وہ اس حسین زندگی کی روحِ رواں تھی۔ بار بار آما کہہ کر وہ تڑپ تڑپ اٹھا۔ آما کے ساتھ عیش کے تمام مناظر یاد کرکے وہ چلاتا۔ ہائے آما کہاں گئی۔ مگر سنگم کی لکیر ختم ہونے پر اسے اقبال کی آواز سنائی دی ؎

میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی

اقبال نے یہ شعر اس کے لئے کہا تھا۔ شاخساران گنگا جمنا کے دو آب کا اشارہ تھا۔ آما مرغِ چمن تھی۔ یہ دور ختم ہوا۔ مگر وہ شاہین کیسے ہو سکتا تھا۔ اس کے پر بندھے ہوئے تھے۔ ایک وقت وہ تھا کہ اسی سنگم کے پاس اس نے لاکھوں ہندوؤں پر فتح پائی تھی اور پھر وہ وقت بھی آگیا جب مٹھی بھر ہندوؤں نے اسے باندھ کر گنگا میں پھینک دیا۔ وہ تلوار کب کی کھو چکا تھا۔ عیش نے آرام طلب اور بزدل بنا دیا تھا۔ انگریزی تعلیم نے تعویذ کھو دیا۔ بے بس بنایا۔ اور اب وہ تیرتا چلا جا رہا تھا۔ موت اس کے لئے نہیں لکھی تھی۔ اس لئے مرا نہیں مگر مُردے سے بدتر تھا۔

"ہائے آما اب تو کہاں ملے گی دیکھنے کو بھی نہ ملے گی۔ کاش میں تیرے مندر کے پاس ہی رہنے دیا جاتا۔ میں تیری مورتی کے درشن کرتا رہتا۔ اسے پوجتا رہتا۔ ہائے میرا دل محبت کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ اب میں کس سے محبت کروں۔ کون معشوق ہے۔"

اقبال کی پھر آواز آئی:۔

ہست معشوقے نہاں اندر دلت
چشم اگر داری بیا بنمائمت
عاشقانِ او ز خوباں خوب تر
خوشتر و زیباتر و محبوب تر
دل ز عشقِ او توانا می شود
خاک ہمدوشِ ثریا می شود
خاکِ نجد از فیضِ او چالاک تر
آمد اندر وجد و بر افلاک تر
در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

"ہاں یہی رازِ عشق" اس نے سوچا۔ "اس نے بھلا دیا تھا۔ جنت ارضی کو جنت عرشی سمجھا تھا۔ آما کو حورِ جنت مان کر اس کے ساتھ مست ہو گیا تھا ؎

دل را بگوشۂ ابروئے جاناں سوختیم
قندیلِ کعبہ را بہ صنم خانہ سوختیم

مگر اب وہ بے بس تھا۔ وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ بری طرح رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ "مگر نہیں" اس نے سوچا "میں اس طرح ہمیشہ نہیں رہوں گا۔ میرے جد آئیں گے میری رسیوں کو کاٹیں گے۔ مجھے اچھا موقع ملا ہے۔ ان کے دھیان میں محو ہو جائے گا۔"

امید اس کے دل کی کیفیت کو بدلتی جا رہی تھی اور وہ دھارے کے ساتھ بہتا جا رہا تھا۔

رہے تھے۔ کربلا تک پہنچنا بھی صبر کا ایک حصہ تھا۔ بیعت سے انکار بھی صبر تھا آخری قطرۂ خون
تک لڑتے رہنا بھی صبر تھا۔ مگر جوا میں ہار گیا۔ میں کچھ نہیں رہا۔ میں نے گولا ای ون پھینک دی
تھی جب پدمنی نے جوہر کیا تھا...... میں روحانیت میں پھنس گیا تھا۔ کیا روحانیت لاحول
ولا قوۃ الا باللہ۔ پسپائیت کا نام روحانیت رکھ لیا۔ اللہ کو بھی ایک بہروپ مان لیا۔ راہب
اللہ۔ بھولوں کا کیمپ۔ ترک دنیا۔ اگر یہ دنیا ترک کرنے کے لئے ہے تو ہم یہاں کیوں بھیجے گئے
ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی آخرۃ حسنۃ ۔ "آخرت اور دنیا دو الگ چیزیں
ہوتی ہیں۔ نہیں۔ نہیں صاف دو راہیں ہیں۔ ان کمبختوں نے دونوں راہیں ایک کر دیں
خیر و شر۔ نیکی بدی کا تصور ہی غائب کر دیا۔
دیکھ لیجئے انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ قتل کرنے کے بعد۔ ڈاکہ ڈالنے کے بعد یہ امید

دعا۔ وظیفہ۔ مراقبہ سب فضولیات۔ لغویات۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِین۔ اللہ کی راہ
صراط المستقیم۔ RIGHTEOUSNESS مجھے دھوکا ہوا۔ کیوں؟ میں نیکی
بد کا تصور ہی کھو دیا تھا۔ اللہ اللہ۔ اللہ کو میں نہیں جان سکتا۔ اس کی راہ کو نہیں جان
سکتا جب تک الذین انعمت علیہم کا تصور میرے سامنے نہ ہو۔ ہیرو ہیرو
ورشپ۔ بت توڑنے کے بعد اس کی جگہ ایک ہیرو لانا ضروری ہے۔ یہی اسلام ہے۔
مگر.... مگر وہ ایک کراسنگ سے گزر رہا تھا۔ اسے ٹھہرنا پڑا...... فٹ پاتھ پر ایک چنے
والا چنے بیچ رہا تھا۔ اس نے جیب سے پیسے نکال کر چنے خریدے۔ دو پیسے کے چنے۔ اب
اس کے پاس کوئی پیسہ نہ رہا تھا۔ شیروانی کی جیب میں چنے ڈال کر وہ کھاتا ہوا چلا۔
اس نے بہترین سے بہترین کھانے کھائے تھے۔ اس کی تمام تہذیب میں کھانے کے سامان کا
بھی خاص شعبہ تھا۔ بادشاہوں کے محلات میں باورچی خانے کیا کمال فن نہ دکھا چکے تھے۔
مگر یہ سب فضول تھا........

کہ جہاں میں نان جویں پر ہے مدار قوت حیدری

اس کے جوانان جری کے سر کٹ کے گرتے تھے......
اس ملک میں یا علی جابرنا ہے۔ مجھے پتے پھانکنا! پتے چبانا! یہی خوراک حیدری ہو
اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِین...... اب شاید لوٹ کر آنے کی کبھی ضرورت نہ پڑے گی۔ وہ بچے کھا رہا تھا......
وہ سڑک کو پار کر رہا تھا۔ اس کے کان میں آواز آئی: "دیکھتے نہیں ہو......"
سوئے ہو۔ ایک کروڑ فٹ پاتھ پر ہو رہا۔ اس کے جوتے کی کیلیں بہت زور سے چبھ رہی تھیں۔ کیا
نے جوتا اتار کر پھینک دیا۔ ننگے پیر چلنے لگا...... وہ صحرا و ریگستان میں ننگے پیر پھرا تھا۔
اپنی آقا کی تلاش میں۔ مگر اب کسی کی تلاش نہ تھی۔ کوئی مقصد حیات ہی نہ رہ گیا تھا۔ وہ زندہ
بھی نہ تھا۔ نہیں۔ زندہ ضرور تھا مگر مر رہا تھا۔ چودہ برس ایک خواب پریشاں کی طرح گزر
گئے تھے...... یہ کیا ہوا تھا...... یہ سب کیا ہوا تھا!

ساری زندگی خواب تھی ـــ
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

جنت کا خواب۔ محمود غزنوی کے ساتھ آگرہ اس خواب کو حقیقت میں تبدیل
ہوتا ہوا دیکھ گیا تھا۔ گنگا جمنا کا دو آب خواب کی دنیا تھی۔ شالامار خواب کی تعبیر تھا۔ سو وہ اس خواب
کی دنیا میں گم ہو جانے کے لئے آیا تھا۔ اس میں گم ہو گیا تھا۔ کیسا سہانا خواب تھا! سہانا
خواب بہار۔ خواب کا پہلا حصہ سہانا ضرور تھا۔ مگر آخری حصہ خواب پریشاں تھا۔ ۱۰۲۳ء
سے ۱۹۶۲ء تک ۹۱۸ برس لمبا خواب۔ مگر یہ خواب کل پانچ ایکٹ کا ڈرامہ تھا۔ اس میں
جو وقت لگا تھا وہ یونانی ڈرامے کے چوبیس گھنٹوں کے برابر تھا۔ اس کی زندگی کے چوبیس گھنٹے تمام
زندگی کے ۹۱۸ برس کے برابر ہوئے یعنی ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک کے پندرہ برس اس
کی زندگی کے چوبیس منٹ کے برابر ہوئے۔ یہ چوبیس منٹ سب سے زیادہ پریشانی کے گزارے
اور اب اس کے کچھ ہی سکنڈ باقی تھے۔ مگر ان چوبیس منٹ کی تکالیف کا خیال اسے چونکا دیتا تھا۔
مجبوری۔ بےبسی۔ سب سے زیادہ بےمقصدی نے اسے بالکل ختم ہی کر دیا تھا اور اب وہ ختم

147
1024
———
1177

1962
1024
———
938
———
15
———
123

1962

نہیں ہونے جا رہا تھا۔

نہیں۔ نہیں۔ "یو ڈونٹ انڈرسٹینڈ" وہ ختم نہیں ہونے جا رہا تھا۔ اس کا سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ وہ ننگے پیر تھا جو تیرے کی کیلیں اب اس کے پیر میں نہیں چبھ رہی تھیں۔ غالب کہہ گیا تھا ؎

ذوق عریانی تجسس نہ دانستم حیف
کوپے سنجف و استبرق رضواں رفتم

اس نے اپنی پھٹی شیروانی بھی اتار کر پھینک دی۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْن۔ اسے کیا کیا تکلیفیں نہیں پہنچی تھیں۔ وہ کانپ گیا۔ اف اف کرنے لگا۔ مگر نہیں۔ یہ صبر کے منافی تھا۔ مگر تکلیفوں کو بھولنا بھی دشوار تھا۔ صبر کے منافی تھا۔ تکلیفیں سب حقیقت تھیں۔ حقیقت تھیں یا خواب تھیں؟ خواب پریشاں؟ مگر وہ اسے اس درجہ پر اتار لائی تھیں۔ یہ سب کیا ہو گیا تھا۔ سب کچھ حقیقت تھا۔ تھا تو وہ سب ایک خواب پریشاں کی طرح اس کے ذہن میں۔ مگر سب حقیقت تھا۔ نہیں تو وہ اس حال میں کیسے آ جاتا۔ سب حقیقت۔ سب خواب۔ اخوت اسلامی! اس کا خواب ہی اسے یہاں کھینچ لایا تھا۔ مگر کہاں ملی؟ اقبال کے اشعار میں، جناح کے عمل میں۔ مگر اب دونوں میں سے کوئی باقی نہ تھا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

کیا گزری؟ کیا گزری؟ ویرانے پہ کیا گزری؟ خود اُس پہ کیا گزری؟ ؎

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا

غلط تھا۔ ضرور غلط تھا۔ خار صحرا۔ نہیں!

ہمارا ساقی تو کانٹوں کی کائنات لیے
ہر ایک نوک پہ اک قطرۂ خوں سا تو لیے
جگر میں گھس کے جو نکلے جگر میں گھستے ہوئے
شگوفے اُگتے گی یہ زرخیز ہے زمیں نفرت
کہ پاش پاش ہو فق ہو کے رنگ روئے بتاں
کہ برف بار ہو عاشق کے دل کا گرم لہو
وہ دور اور تھا نفرت تھی فطرتِ شیطاں
یہ دور اور ہے نفرت ہے فطرتِ انساں

فطرت رجلع ؟

نہ ماند شیوۂ زہاد کو بجز بہتاں
ولے عداوت زہاد کو بجز باقیست

یاالٰہی سکرت ابصارنا
فاعفعنّا اثقلت اوزارنا

وہ چکرا کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ اس کے تصور میں عجیب عجیب نقشے آئے۔ ایک کالا داڑھی والا آدمی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرا۔ اس کے کانوں میں آواز آئی "ہماری تہذیب مغل دربار کی ہے۔ ہماری تہذیب اسلامی ہے۔" اس نے اپنا سر پکڑ لیا اور کہنے لگا۔ گدھا۔ گدھا۔ گدھا! اس کو کون سمجھائے۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

"اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ قدم آگے بڑھا۔ پھر وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ پھر ایک گورا مرتا ہوا اس کی آنکھوں کے سامنے پھرا۔ کانوں میں آواز آئی "رب نیڑا کہ گھونسن۔ تو یہاں ڈاکہ مارنے

Scanned with CamScanner

تا ہے ہماری روٹی کاٹنے آیا ہے؟ وہاں سب مسلمان آرام سے رہ رہے ہیں۔ یہاں جگہ نہیں ہے۔ تنا! چلا جا۔ بھاگ" اس نے پھر اپنا سر پکڑ لیا۔ اس کی زبان پر یہ شعر آیا ؎

مدد کو آؤ مولا اشقیا دل کو ہلاتے ہیں
بڑھو صبر و شکیبائی کے دامن چھوٹے جاتے ہیں

وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ غالب نے ہر بات کی پیشین گوئی کر دی تھی ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

وہ پھر اٹھ کر چلا۔ گرلز کالج کے پاس پہنچ گیا۔ پھر جھجکا یا اور کالج کی دیوار سے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ ایک نہایت موٹی بڑے بڑے پستان والی عورت کا نقشہ اس کے سامنے پھرا۔ اس کے کانوں میں آواز آئی "یہ لیو پاوالا بڑا حرامزادہ ہے۔ جھوٹا بنتا ہے مکار ہے۔ شرور۔ شرادو۔ شرور نکال دو۔" "میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ مجھے کیوں خون کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔" اس نے کہا — اُسے محسوس ہوا جیسے کہ وہ اب بھی سو رہا تھا۔ عجیب عجیب آوازیں اس کے کان میں آ رہی تھیں۔ "اچھا ہوا اگر اچلتی ہوئی بس سے اترنے کا یہی نتیجہ ہے۔" "یہاں کیوں آیا کوئی بلانے گیا تھا؟" — "ہم کہتے تھے یہاں سے چلا جا" — "صدق آ پیچھے نہ گزرا" — "ضمیر تو ہے ہی نہیں" — "اس کے پاس سند وند نہیں ہے۔ کالونی کرنے چلا ہے جعلیہ۔ نکال دو کچہری سے" — "ہم کب تک مہمان رکھیں گے۔ کوئی کام کرو۔ چنے بیچو" — بے ایمانوں کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ چار سو بیس کہیں کے۔ تمہارے لئے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ٹھیک اپنے نتیجے کو پہنچے۔" اس نے مولانا روم کا شعر گنگنایا ؎

ترسم دلو میہت دآں آوازِ غول
می کشد گوشے تو در قعرِ سفول

وہ اپنا سر اپنی باہوں میں دبا کے بیٹھا رہا۔ شاید سو گیا۔ نہیں۔ نیند تو اسے

نہیں آ رہی تھی۔ دیر تک وہ یونہی بیٹھا رہا ..... پھر اس نے سر اٹھایا۔ فرار، فرار، فرار، مفر نہیں ہے۔

"پسپائی کا نام صبر رکھ لیا ہے حرامزادوں نے" مولانا روم کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

اے ہمہ دریا چہ خواہی کرد نم
اے ہمہ ہستی چہ می جوئی عدم
تو خوشی و خوب و کانِ ہر خوشی
تو چرا خود منت بادہ کشی
تاج کرمناست بر فرقِ سرت
طوق اعطیناک آویزِ برت

اُسے محسوس ہوا کہ اس کے اندر ایک نئی جان آ گئی۔ اس کے پاجامے کا داہنا پائنچا پھٹ گیا تھا۔ اس نے اسے گھٹنے تک پھاڑ کر الگ کیا۔ دوسرا پائنچا بھی آدھا ہی پھاڑ ڈالا۔ آخری شعر کو گنگناتے ہوا۔ وہ آگے بڑھا۔ پرنس روڈ کے چوراہے پر پولیس نے راستہ روک لیا تھا۔ مگر وہ اپنی دھن میں سڑک کو پار کرنے لگا۔ پولیس نے ڈانٹا، "دیکھتا نہیں ہے بے تقیر" وہ فٹ پاتھ پر واپس گیا۔ موٹریں، بسیں، رکشے اس کے سامنے سے نکلتے رہے۔ لوگ، عورتیں، موٹی، تندرست، بچے ساتھ لئے ہوئے۔ ہر تیسری کے پیٹ میں بچہ۔ پولیس نے اشارہ دیا۔ وہ بھی سڑک کو پار کرنے لگا۔ وہ گنگنا رہا تھا ؎

تاج کرمناست بر فرقِ سرت
طوق اعطیناک آویزِ برت

مگر اس کے اکیلے ہونے میں کوئی شک نہ تھا۔ اس کا کوئی دوست کوئی ہم زبان ہم خیال نہ تھا۔ وہ ہر جگہ سے دھکیل کر نکالا گیا تھا۔ اس نے ہر دروازہ جھانکا تھا۔ مگر کسی نے اس کو سہارا نہ دیا تھا۔ غربت کا لفظ اس پر پورا اترتا تھا۔ وطن۔ اس کا ایک وطن

ضرور تھا۔ مگر اس کے ہم وطن اس کے خلاف ہو گئے تھے اس کو باندھ کر دریا میں چھوڑ دیا
وہ یہاں بہہ آیا تھا۔ اقبال نے اسے بتایا تھا ؎

ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

یہ وطن کہاں ہے؟ یہ اور ہی کچھ کیا ہے؟ اسے تو یہ محسوس ہوا ؎

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اُجالا نہیں ہوتا

ہائے۔ ہائے کسی نے نہ پوچھا۔ ہر ہر طرح کی شمعیں جلائیں مگر اجالا نہ ہوا۔ اُن ار

صورتیں اُمید کی خراب پریشاں ہوگئیں
سامنے آنکھوں کے آئیں اور پنہاں ہوگئیں

وطن تمت سے ہے ٹھیک۔ اس کے اجداد سب نے ترک وطن کیا۔ ؎

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوب الٰہی

مگر ؎

ہم نے سو راہ اخوت کی نکالی لیکن
نہ تو اپنا ہوا اپنا نہ پرایا اپنا

اکیلا۔ اکیلا۔ بالکل اکیلا۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ اسے کوئی نہیں اپنا نا چاہتا
مگر اس نے سوچا۔ "انھیں کون چاہتا تھا۔" ان کو ڈھیلے مار کر زخمی کر دیا۔ ایک لڑکا ان کے
ساتھ تھا جو ڈھیلے مارنے والوں کو اٹھا اٹھا پٹختا تھا۔۔۔۔۔ مگر یہ لڑکا بھی حیران ہوا۔ ان
بھی اکیلا رہ گیا۔ کیا عالم ہوگا۔۔۔۔۔ اور اس لڑکے کا لڑکا اس کے تو سب ساتھی مار
گئے تھے۔ ہزاروں کے مجمع میں اکیلا۔ پیاسا۔ تیروں سے جسم چھلنی اور پھر بھی کہہ رہا تھا
ھل من ناصر ینصرنا۔ کوئی اس کی مدد کو نہ آتا تھا۔ وہ اپنے نانا کے بتلائے ہوئے
طرف دیکھتا اور کہتا۔ ربنا آتنا من لدنک رحمۃ وھیٔ لنا من امرنا رشدا۔ رضائم بقضا

[illegible] ہے جس کا یقین بہتیں کر رہی اس کا خواب ہے ؎

موسٰی و فرعون و شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید

یہ جھگڑا چل رہا ہے۔ ہمیشہ سے چل رہا ہے۔ ہمیشہ چلتا رہے گا۔ اہرمن۔ اہرمزد
شیطان۔۔۔۔۔ شیطان شیکسپیر کا ایاگو۔ ہانسٹ ہانسٹ ایاگو۔ مانی ڈیڈ بالنسے
ٹ ایاگو ایسے ہی اس کے دوست تھے۔ اس کو کیسا دھوکا دیا۔ اس کو اس درجہ پہ مار دیا۔
پھر وہ گیا سب نے نہیں نہیں کی صدا لگائی ؎

ایں سزائے آں کہ شد یار خساں
یا کسی می کرد ہیہات نا کساں

احمق ہی احمقوں کا دوست۔ یہ نہ سمجھا ؎

چشم بینا از لقائے حق شود
حق بنگی چھپ از ہر احمق نشود

عیش کی زندگی نے اس کی عقل ختم کر دی تھی۔ تہذیب عیش کا دوسرا نام تھا۔
علم نے عیش کو بڑھایا۔ سید احمد خاں نہیں سرسید انگریزی پڑھوانے چلا تھا۔ بیچارا
نہ سمجھا تھا ؎

بدگہر را علم و فن آموختن
دادن تیغ است دست راہزن

پھر تعلیم ایک مستقل لعنت لائی۔ لعنت۔ لعنت کیا ہے ؎

لعنت آں باشد کہ خود بینش کند
حاسد و بکر بین و پرکینش کند

یہی تعلیم یافتہ کی تعریف ہے۔ تعلیم گاہیں غنڈہ پن کے مراکز۔ اقبال نے کہا ؎

ان سطروں کا ایک ایک لفظ اس پر صحیح اتر رہا تھا۔ وہ تیزی سے چلا جا رہا تھا اور جب اس نے آگے کی سطور پڑھیں۔

But with unhurrying chase,
And unperturbed pace,
Deliberate speed, majestic instancy,
They beat —and a Voice beat
More instant than the Feet—
"All things betray thee, who betrayest Me."

آخری سطور کو وہ نہ معلوم کتنی دفعہ دہراتا رہا۔ کیا قیامت ہے کس شان سے کس رفتار سے کس زور سے وہ اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ ہر چیز اسے دھوکا دے رہی تھی۔ کیونکہ وہ اسے دھوکا دے رہا تھا۔ Deliberate speed اور majestic instancy سے جا رہا تھا وہ اس کے پیچھے۔ آف۔ آف بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہ بلیئن مارکٹ تک یوں ہی دوڑتا ہوا پہنچ گیا۔ مارکیٹ کی بھیڑ میں وہ ٹھٹھکنے لگا۔ ہاہاہا پیسے۔ دکانیں۔ ٹرام گاڑیاں بسیں۔ پوری دنیا ایک مشین بنی بس کی طرح دوڑ رہی تھی۔

۱؎ میں نے اس سے بھاگ کر پناہ چاہی۔ راتوں میں اور دنوں میں۔ سالوں کی محرابوں میں۔ اپنے ذہن کے پیچیدہ راستوں میں۔ آنسوؤں کے دھوئیں میں میں نے اپنے کو اس سے چھپایا اور رواں قہقہوں میں۔ امیدوں کے راستوں پر میں بھاگا۔ اور خوف کے گڑھوں کے اندھیاروں میں تیزی سے گرا۔ ان زبردست پیروں سے جو میرا پیچھا کر رہے تھے۔

۲؎ لیکن مستقل رفتار کے ساتھ اور نہ ڈگمگانے والے قدم کے ساتھ بے شعوری رفتار سے اور شاہانہ استقلال کے ساتھ ان کی چاپ آتی رہی اور ایک آواز پیدا ہوتی رہی۔ جو چاپ سے زیادہ مستقل تھی۔ "ہر چیز تجھے دھوکا دے گی جو مجھے دھوکا دے رہا ہے۔"

سرمایہ۔ سرمایہ دارانہ نظام اپنی رفتار سے چل رہا تھا۔ شیطان، شیطان۔ یہ دنیا اللہ کی بنائی ہوئی ہے؟ نہیں آدمی کی بنائی ہوئی ہے، آدمی جس میں شیطان غالب ہے۔ Bosen Die اس کی الجھن بڑھ گئی۔ وہ چلتا ہی چلا گیا۔

All things betray thee who betrayest Me

وہ میری ویدر مارکیٹ تک پہنچ گیا۔ وہ تھک گیا تھا۔ آہستہ سے آگے بڑھ کر بائیں طرف گودام کی دیوار سے لگ کر وہ بیٹھ گیا۔ فرانسس ٹامسن کی نظم اسے پوری یاد تھی۔ وہ اسے پڑھتا رہا۔ وہ ان سطور کو زور زور سے پڑھنے لگا۔

Naked I wait Thy love's uplifted stroke :
My harness piece by piece Thou has hewn from me,
And smitten me to my knee ;
I am defenceless utterly.
I slept, methinks, and woke,
And slowly gazing, find me stripped in sleep.

اسے معلوم ہو رہا تھا کہ یہ سطور اس نے خود لکھی ہیں۔ وہ آگے بڑھتا ہی گیا۔ اور سطور پڑھیں۔

۱؎ عریاں ہو کر اب میں تیری محبت کی ضرب کا انتظار کر رہا ہوں۔ میری زرہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر گئی۔ میرا جسم دو ٹکڑے ہو گیا۔ میں بالکل مجبور ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں سو رہا تھا اور جاگ کر دیکھتا ہوں کہ سونے میں میرا لباس اتار لیا گیا۔

Scanned with CamScanner

محنت کرنے سے باز رکھا تھا۔ وہ محنت کرنا بھول گیا تھا۔ یہاں کا سوا محنت مانگتا ہے ... ہو سکی۔ سوا پھول نہیں کانٹے ہوتے ہیں۔ کانٹے اس کے پیچھے اس کے دل کے ... اور بھی کانٹے بچھا گیا تھا۔ یہ کلرک۔ یہ وکیل۔ یہ ماسٹر کانٹے بوتے ہیں ... ہر قسم کا کانٹا اس کے چبھا۔ کیوں؟

کس نہ دانست کہ من نیز بہائے دارم
آں متاعم کہ شود دست زد بے بصراں

بے بصراں نہیں سمجھے۔ قائداعظم ہر ایک سے کہتے تھے۔ "یونائیٹڈ وی اسٹینڈ۔" انہوں نے مجھ سے بھی یہی کہا تھا۔ اسے یاد آیا۔ اس وقت اسے غصہ آیا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ سچ کہتے تھے۔ قائداعظم خود تو سمجھتے تھے لیکن ہر ایک کے لئے ان کی بات سمجھنا مشکل تھا۔ ذہن میں حل تھا جو وہ سمجھتے تھے۔ اس پر انہوں نے مجاہد کی طرح عمل کیا۔ نتائج ... جناح کی سمجھ ہونا چاہیے۔ ہر ایک کی وہ سمجھ نہیں ہو سکتی ہے

چشم چیں از لقائے حق شود
حق بجا ہمراز ہرا حمق شود

"کیا مجھ میں وہ سمجھ ہو سکتی ہے؟" اس نے سوال کیا۔ "کیوں نہیں؟" اس کے دل نے جواب دیا۔ "وہ سمجھ تجھ میں ہے۔ جناح سے زیادہ سمجھ ہے۔ جناح سے زیادہ علم ہے۔ جناح سے زیادہ تجربہ ہے۔ مگر جناح کا سا عزم نہیں۔ جناح کا سا عمل نہیں۔ وہ دیکھنے میں انگریز تھا مگر روح اس کی مسلمان تھی۔ تمہاری روح ہندو، تمہاری عقل انگریز۔" ... سمندر کی ہوا اب تیز ہو گئی تھی۔ اس میں سے وہی راگ نکل رہا تھا

بیا کہ از گہرت یاد می کند دریا
بیا کہ تشنہ لبت را طلب کند تسنیم

وہ پورٹ پر پہنچ گیا اور خلاصیوں میں شامل ہو گیا۔ بوجھ اٹھانے کا عادی نہ تھا۔

وجاہت کی تھی۔ وکالت کی تھی۔ آدمیت سے بے بہرہ ہو چکا تھا۔ آدم کے بیٹے کام مزدوری سے ذہنیت دور ہو چکا تھا۔ اس کے جد علی مرتضیٰ بھی زمین کھودا کرتے تھے۔ مگر اس کو تہذیب نے کام سے بالاتر کر دیا تھا۔ نہیں جب وہ غزنی میں سپاہی تھا تو سب ہی مشقت کے کام کر لیتا تھا۔ مگر ہندوستان نے مشقت کی عادت کو ختم کر دیا۔ وہ نبی کا ماننے والا نہ رہا۔ بستر کیا تھا۔ اس کے ایمان کا خاتمہ۔ بھاڑوں کے گھوڑے دور کر رہ گئے۔ انگریزوں کا دماغ انگریزوں کی قوموں کے سامنے یہ گھوڑے بھاگے۔ تلوار ہاتھ سے چھٹ گئی۔ تلوار لڑائی کا ہتھیار۔ مسلمان اسی ہتھیار پر بھروسہ رہ گئے۔ انگریز نیا ہتھیار بنا لئے وہ مسلمانوں پر حاوی ہو گیا۔ اس وقت جنگ عظیم کون جیتا۔ وہ ہی جس کے پاس سامان زیادہ تھا۔ مسلمان بے سر و سامان ہے اس لئے دنیا کی قوموں میں ذلیل ترین ہے۔ انگریز کا خادم ہے۔ وہ سپاہی گیری چھوڑ کر عیش پسندی پر آ گیا تھا اسے پھر علیؑ ہونا تھا۔

شیر یزداں شاہ مرداں قوت پروردگار
لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

آجکل ذوالفقار کیا کام دے گی۔ ذوالفقار کوئی چیز نہیں۔ قوت بازوئے علی چاہئے۔ ذوالفقار آسمان سے اتر آتی ہے۔ اگر وہ علی کی راہ پر قائم ہوتا تو بجائے ان کھاجر کپڑوں، باتوں، شعروں، عیشوں، محبتوں کے جو اس پر شیطان کی طرف سے اترتی رہیں اس پر بھی ہوائی جہاز اور ایٹم بم اسی طرح اترتے جس طرح انگریز قوم پر اترے

کنت کنزاً رحمۃ مخفیۃ
فبعثت امۃ محمدیۃ

اس نے بوجھ اٹھایا وہ بوجھ لے کر دوڑا۔ وہ سب مزدوروں سے زیادہ کامیاب ہوا۔ اس کو شام تک اس کے لئے مزدوری کے ملے۔ دوسرے مزدوروں سے اور اس سے ملاقات بھی ہو گئی تھی۔ چلتے وقت کسی نے اس سے سینما چلنے کے لئے کہا اور کسی نے عیش کی جگہوں

Scanned with CamScanner

دیا گیا۔ وہ بت پرست رہا۔ پھر ایک بت کو پوجنے کے لئے آیا۔ اسی بت کو پوجتا رہا مسلماں[۱]

مسلماں چو بو و خوئے کافران
لا الٰہ گویاں و از خود منکران

سمندر کی آواز بولنے لگی۔ "آمنو۔ آمنو[۱]"........ آسمان پر ایک نور نظر آیا۔ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً[۲] اس نور و علیٰ نور میں وہ گم ہو گیا۔ پھر آواز آئی۔ یہ کائنات کی آواز تھی۔ قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم[۳]

صبح کو اس کی آنکھ کھلی۔ سمندر کی جگہ غالب کی آواز آ رہی تھی:۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مصروفِ حق ہوں بندگی بوتراب میں

وہ چونکا اور غالب کی آواز اقبال کی آواز میں تبدیل ہو گئی۔

ہر کہ در افلاک گردد بوتراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب
زیر پاش اینجا شکوہ خیبر است
دست او آنجا قسیم کوثر است

اب اس کے لئے ایک نئی صبح تھی۔ تمام تکلیفیں تمام تلخ تجربے جو اسے حاصل ہوئے تھے وہ سب اپنی جگہ پر حقیقت تھے۔ مگر اسے ان سے بھاگنا نہ تھا۔ اسے ان سے

---

[۱] ایمان لاؤ۔

[۲] تعریف اس کی جو لے گیا اپنے بندے کو رات میں.....

[۳] کہہ دو کہ تمھیں پھر زندہ کرے گا جس نے پہلی دفعہ خلق کیا تھا اور وہ تمام خلق کا عالم ہے۔

لڑنا تھا۔ ہندویت اور عیسائیت سکھ نے جذبات کے ذریعے دوسری نے عقل کے ذریعے سے فرار ہی سکھایا تھا۔ یہ سب غلط تھا۔

پھر اقبال کی آواز آئی:۔

ہے درد جہانگیری آن قرب میسر نیست
گلشن جگر یاں کش اسے بو گلاب آمد

اب تک وہ یا تو صاحب رہا تھا اور یا دکیل شاعروں کا ساتھی یا کلرکوں کا ساتھی۔ اب اسے خود لیڈر بننا تھا۔

پلیٹ فارم پر کرنیوں کے چلنے کی آواز آئی۔ وہ لپک کر آیا اور مزدوروں میں شامل ہو گیا۔ وہ پیٹھ پر بوجھ اٹھائے جا رہا تھا اور یہ شعر گنگنا رہا تھا۔

یہ کہہ رہی ہے پلٹ کر نگاہ یار ابھی
زمانہ اور بھی آئے گا ایک بار ابھی

وہ شعر گنگنا رہا تھا اور بڑے جوش کے ساتھ بوجھ اٹھا رہا تھا۔ وہ پھر گنگنایا۔ ایک مزدور اس کے پاس آیا اور بولا "بڑی مصیبت میں زندگی کٹ رہی ہے۔"

"مصیبت کوئی چیز نہیں ہے۔" اس نے کہا

"کیوں گھر سے بے گھر ہوئے اور یہاں سر چھپانے کو کوئی جگہ بھی نہیں ہے۔"

"کچھ نہیں۔ تم نہیں سمجھتے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ تو سنو؟"

"یہ کیا؟ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"سب مسلمان ایک قوم ہیں کہ نہیں؟"

"ہاں ہیں۔"

"اور ایک جگہ کے رہنے والے بھی ایک قوم ہیں جیسے بنگال کے رہنے والے بنگالی قوم۔ پنجاب کے رہنے والے پنجابی قوم۔ ہم تم ایک قوم۔"

Scanned with CamScanner

گھر بجائے ایک گیری مقصد ٹھہرا۔ فتوحات۔ فتوحات۔ ہر لیڈر خدا کے بجائے اپنے لئے لڑا اور
اس لڑائی کو جہاد کہا۔ اپنے کو خدا کا دوسرا کہلوایا۔ اپنے فکر کو اسلام کہلوایا۔ دوسری قوموں
کے لئے اسلام ظلم تشدد اور خونریزی کے ہم معنے ہو گیا Religion of world
گبن نے یہ طنزاً کہا۔ ly success

تو اسلام ختم ہو گیا۔

نہیں اسلام نہیں ختم ہو سکتا۔ وہ انسان کی قسمت ہے۔ انسان اس کی طرف آ کر
رہے گا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ضرورت یہ ہے کہ اب جبکہ ہم اس قدر زیادہ
روشن خیال ہو گئے ہیں ہم اس کی لکیر کو سیدھا کر لیں۔

مگر سیدھی لکیر کیا ہے۔

یہ بہت ہی سیدھی بات ہے علی جب عمر عبدود کی گردن کاٹنے چلے تو اس نے
آپ کے منہ پر تھوک دیا۔ آپ نے تلوار روک لی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اسے قتل کیا۔ لوگوں
نے بعد میں پوچھا کہ یہ کیا کیا تھا آپ نے۔ فرمایا کہ مجھے غصہ آ گیا تھا۔ اگر غصے میں میں اسے
قتل کرتا تو اس کا قتل اسلام کے لئے نہ ہوتا۔ یہ ہے سیدھی لکیر۔ ہر کام میں یہ دیکھنا ہے کہ یہ
میری ذات کے لئے ہے کہ اسلام یا خدا کے لئے۔ میں نے ہندوستان خدا کے لئے نہیں فتح کیا تھا۔
اپنے لئے فتح کیا تھا۔ دنیا کے زیادہ تر فاتح اپنے لئے فتوحات کرتے رہے۔ لہذا دنیا اس لعنت
کو آئی ہے اور لعنت کیا ہے؟ مولانا کہتے ہیں

لعنت آں باشد کہ خود بینش کند
حاسد و کژ بین و پرکینش کند

یہ خود بینی ہی لعنت ہے' اپنے کو خدا سمجھنا۔ اپنے مطالب کے لئے خدا کو ماننا۔ یہ
راہ ضلالت ہے۔ اس میں اطمینان نہیں۔ اب دو جنگوں کے بعد پریشان ہو کر وہ اطمینان کی
تلاش میں ہے۔ اطمینان کہاں ملے گا؟ اسلام میں خدا کے لئے کام کرنے میں۔ اسلام کے سبب

اہم اول نے کہا رضینا بقضائہ وتسلیماً لامرہ انا للہ وانا الیہ راجعون

"اچھا یہ بتایئے کہ قائد اعظم نے پاکستان اپنے لئے بنایا تھا کہ کس کے لئے"

"یہ معاملہ پیچیدہ ہے۔ ایک بات صاف ہے کہ انہوں نے اپنے لئے اسے نہیں بنایا۔
مگر انہوں نے اسے اللہ کے لئے بھی نہیں بنایا۔ انہوں نے اسے ہندوستان کی اسلامی قوم کے لئے بنایا۔
یہ قوم کیا؟ ایک قوم تو اسلامی دنیا کے سب مسلمان — ایک قوم انگریزی میں ایک ملک
کے رہنے والے اور ایک زبان بولنے والے — گاندھی نے جب ہندوستان کے رہنے والوں
کو ایک قوم کہا اور عمل میں ہندو ایک ہو کر مسلمانوں کو ختم کرنے لگے تو ہم کو بھی ہندوستان کے
مسلمانوں کو الگ قوم کہنا پڑا اور اس قوم کے لئے الگ گھر بنانا پڑا۔ مگر قائد اعظم رخصت
کی جماعت بھی مر گئی اور اب .... اسلامی قوم اور انگریزی قوم کے تصورات میں جھگڑا
سمجھا دو مارے گئے ہم اور تم۔

ٹھیک کہتے ہیں مگر اس کا علاج کیا ہے؟"

"علاج؟ اسلام۔ رب المشرقین والمغربین میں عقیدہ اور علاج کرنے والے
ہم اور تم۔"

مگر ہم لوگ جاہل ہیں۔ نادار ہیں۔ مجبور ہیں۔"

یہ سب بہت اچھا ہے۔ ہم جاہل ہیں تو اچھا ہم غلط عقیدے سے بچیں گے۔ نادار
ہیں تو اچھا ہمیں کچھ نہیں کھونا ہے۔ مجبور ہیں تو ہمت اور عزم کی طرف ہمارا آنا ضروری ہے۔
ہم سب برابر مجبور ہیں۔ آپس میں حسد کا سوال نہیں اٹھتا۔ ہمارے اور انسانیت کے درمیان
کوئی چیز نہیں حائل ہے۔ اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر سب ایک ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ
پاکستان سنگ میل ہے منزل نہیں ہے۔

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

Scanned with CamScanner

سب مزدور اپنی اپنی طرف چلے گئے۔

اکیلا! اکیلا! اکیلا! سمندر سامنے آسمان سر پر!

ہر کام اکیلے آدمی نے ہی شروع کیا۔ وہ اکیلا ہی سنگم پر چلا گیا تھا۔ کامیابی کے زعم میں وہ ملک گیری ہی کو مذہب سمجھتا تھا۔ مگر اب اسی تمام تجربے نے اسے صحیح اور غلط کا وہ شعور دے دیا تھا جو یہاں آتے وقت اس میں نہیں تھا۔ اقبال کی آواز آئی۔

ہو نہ سرگشتہ اگر چل گئی تعمیر تیری

مانِ توحید حکومت نہیں تقدیر تیری

اور براؤننگ کی

Doth life succeed in what it seems to fail.

وہ Patriot to Women رہا تھا۔ جنت ارضی کو جنت عرشی مان کر سورۂ رحمٰن پڑھنے لگا تھا اب Patriot to Heaven! ہونا تھا۔

Maker remake, complete, I trust what thou shalt

اقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان فبای آلاء ربکما تکذبان

مگر اب اس کے لئے یہ وقت تھا Reculer four Mieux sauter.

قوم کی رہبری کے لئے بڑھنے سے پہلے خود کو پختہ کرنا ضروری ہے وہ شعر گنگنانے کا ہمیشہ عادی تھا اور یہ شعر گنگناتا ہوا سو گیا ۔

اے ماحیِ نقشِ باطل من

اے فاتحِ خیبرِ دلِ من

Cependant, tout en haut de l'univers juche,
Un ange sonne a victoire
De ceux dont le coeur dit: "Que bene son fouet
Seigneur: que la Douleur, O Pere, soit beniel
Mon ame dans tes mains n'est pas un vain jouet,
Et ta prudence est infinie"
Le son de la trompette est si delicieux,
Dans ces soirs solennels de celestes vendages,
Qu'ils'infiltre comme une extase das tous ceux
Dont elle chante les louanges.

ناشر ــــــ بنی پبلیکیشنز
٢٠٧ - الحیات چیمبرز
ایم اے جناح روڈ کراچی

طابع ــــــ ڈیسنٹ پریس کراچی

بار دوم ــــــ جولائی ١٩٧١ء
تعداد ــــــ گیارہ سو
قیمت ــــــ آٹھ روپے

رحمۃ للعالمین

کی

خدمت میں

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

0300 9806669 ابو مجتبیٰ جعفر
پی ایچ ڈی اردو ریسرچ سکالر
نمل یونیورسٹی اسلام آباد